

جنوب کا شعروادب

علیم صبا لویڈی کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا انتخاب

مرتب

ڈاکٹر محمد علی انصاری

[مجمہ حقوق بحق مصنف محفوظ]

Ace. No.

نام کتاب 410

جنوب کا شعروادب

۷۸۶

تعداد

60 روپے

قیمت

ڈاکٹر محمد علی انثر

891.43909

11

نام مرتب

500002 20-4-226/9 - چوک - حیدرآباد

پتہ

علیم صبا تویدی

مصنف

26 امیرالنساء بیگم اسٹریٹ - مونٹ روڈ - مدراس

پتہ

ٹمل ناڈو اردو پبلی کیشنز - مدراس

طابع و ناشر

جون 1993ء م 1413ھ

سن اشاعت

قیصر سرمست "حیدرآباد"

سرورق

ملنے کے پتے :

دہلی، ممبئی، علی گڑھ۔

۱۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

رانی منڈی اللہ آباد - دیوبند،

۲۔ شب خوں کتاب گھر

برہ پورہ، بھاگلپور - بہار۔

۳۔ مکتبہ کہسار

نیاپورہ، مالیکائوں (ناسک)

۴۔ مکتبہ توازن

26 امیرالنساء بیگم اسٹریٹ - مونٹ روڈ - مدراس

۵۔ ٹمل ناڈو اردو پبلی کیشنز

آصف علی روڈ - نئی دہلی

۶۔ اسٹار پبلی کیشنز

فہرست

A. No.
410

5	مقدمہ	۱
14	شہر مدراس میں اردو نثر کا ارتقاء	۲
29	تمل ناڈو میں اردو افسانہ	۳
42	تمل زبان کے جدید افسانہ نگار	۴
50	غالب کا ایک ہم عصر — لطیف آرکائی	۵
68	نواب تاج محل حسین خان ایمان گوپاموی	۶
75	مولانا عبد الحمئی احقر بنگلوری	۷
88	پروفیسر غلام حسین دلیل مدوری اور نظم کائنات	۸
98	علامہ فدوی باقوی کا فکری سفر نامہ	۹
108	مولانا راہتی فدائی اور کڈپہ میں اردو	۱۰
113	صنفِ دوہا اور ساغر حبیدی	۱۱
121	ڈاکٹر راہتی قریشی اور عکس کی ہجرت	۱۲
126	اکرام کاوش اور آبِ زر	۱۳
134	عبد القادر ادیب — بحیثیتِ انشائیہ نگار	۱۴
139	یعقوب اسلم کی افسانہ نگاری	۱۵



۵۰

علیم صبا تویدی اردو کے اُن معدودے چند قلم کاروں میں شمار ہوتے ہیں جن کی تخلیقی صلاحیتیں محض ایک دو اصنافِ ادب تک محدود نہیں۔ ایک طرف جدید شاعری کی حیثیت سے انہوں نے مختلف اصنافِ شعر جیسے غزل، آزاد غزل، ہائیکو، سانیٹ، لغت گوئی وغیرہ میں، اربابِ نقد و نظر سے اپنی ایک منفرد اور نمایاں حیثیت منوائی ہے۔ جس کے ثبوت کے طور پر ان کی شاعری کے تعلق سے تحریر کئے ہوئے وہ مضامین کے مجموعے ہیں جو اردو کے ممتاز نقادوں پروفیسر سلیمان اظہر جاوید، پروفیسر نجم الہدیٰ، جناب کاظم نائٹی، ڈاکٹر اختر بستوی اور راقم الحروف نے مرتب کئے ہیں۔ علیم صبا کی ہمہ جہت ادبی شخصیت کا دوسرا نمایاں پہلو نثر نگاری کے میدان میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کے افسانوں کے دو مجموعے ”شکاف در شکاف“ اور ”اجلی مسکراہٹ“ بہت پہلے ہی

شائع ہو کر اہل اردو سے نراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی ترتیب و تدوین سے متعلق کتابوں میں ”آزاد غزل شناخت کی حدوں میں“، ”قید شکن“، ”ثبوت“، اور ”تذکرہ شعراءِ تامل ناڈو“ کے نام لائقِ ذکر ہیں۔

ادھر کچھ عرصہ سے علیم صبا نویدی کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین اردو کے موقر علمی و ادبی رسائل میں شائع ہو رہے ہیں۔ اور اب انھیں مضامین کو ”جنوب کا شعر و ادب“ کے عنوان سے کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

پیش نظر کتاب چودہ مضامین پر مشتمل ہے۔ جن میں ابتدائی تین مضامین ”شہرِ مدراس میں اردو نشر کا ارتقاء“، ”تامل ناڈو میں اردو افسانہ“ اور ”تامل زبان کے جدید افسانہ نگار“ تامل ناڈو کے نثری کارناموں سے متعلق ہیں۔ تاریخ ادب اردو پر سرسری نگاہ ڈالنے سے اس بات کا انداز لگانا دشوار نہیں کہ ابتداء ہی سے شاعری کی یہ نسبت نثر نگاری کی جانب بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ یہی سبب ہے کہ شعرا کے مقابلے میں نثر نگاروں کی تعداد نسبتاً کم رہی ہے۔ لیکن یہ بات باعثِ طمانیت ہے کہ ادھر کچھ عرصے سے شائع ہونے والے رسائل اور کتابوں میں مختلف اصنافِ نثر کو خصوصیت کے ساتھ موضوع بنایا جا رہا ہے۔

نوشی کی بات ہے کہ علیم صبا نویدی نے تامل ناڈو جیسے دورِ افتادہ علاقے میں رہتے ہوئے بھی جنوبی ہند میں اردو نثر کی نشوونما کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ پہلے مضمون میں شہرِ مدراس میں اردو نثر کے آغاز و ارتقاء کا جائزہ لیتے ہوئے علیم صبا نویدی مطلع کرتے ہیں کہ اس سرزمین میں اردو کے تحریری آثار کی ابتدا ”زنجیرہ“ اور ”درالاسرار“ کے مصنف اور صاحبِ دیوان شاعر شاہ سلطان سے ہوتی ہے۔ پھر سید شاہ عبدالقادر (میراں شاہ ولی اللہ) شیخ محمد محمد عبدالحق ساوی اور شاہ ابوالحسن قرقی کے رسائلِ تصوف سے لے کر ڈاکٹر عبدالحق (مصنف انشا و حق)

تک کے نثری کارناموں پر طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے، جنگِ آزادی کے بعد سرزمینِ مدراس میں اُبھرنے والے چھتیس سال قلم کاروں کے نثری کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس مختصر سے جائزہ میں علیم صبا نے مدراس میں اردو کے ارتقا اور نثر نگاری کے میدان میں یہاں کے فن کاروں کی علمی و ادبی کاوشوں کو پردہ خفا سے باہر نکالنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ لیکن علیم صبا صاحب نے تامل ناڈو کے قدیم نثر نگاروں کی جو فہرست دی ہے اس میں ”ریاضِ غوثیہ“، ”ریاضِ مسعود“ اور ”ضیافت نامہ کے مصنف غوثی آرکاٹی کا نام شامل ہونے سے رہ گیا ہے۔ کتب خانہ آصفیہ (اور نیٹل منیسکٹر لائبریری، حیدرآباد) میں غوثی آرکاٹی کی ایک قلمی نثری تصنیف ”تفسیر غوثی“ (مخطوطہ نمبر ۵۴۵، تفسیر) کے نام سے ملتی ہے۔ جس میں غوثی نے ”پارہ عم“ کی تفسیر قدیم اردو نثر میں لکھی ہے۔ اس کے علاوہ اگر علیم صبا نویدی صاحب اس مضمون میں جامعہ مدراس کے شعبہ اردو میں ایم اے، ایم فل؛ اور پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے لکھے گئے تحقیقی مقالوں کو بھی شامل کر لیتے تو بہتر تھا۔ جہاں تک راقم الحروف کی معلومات کا تعلق ہے، مدراس یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں پروفیسر نجم الہدی، ڈاکٹر عابد صفی اور ڈاکٹر سجاد حسین کی نگرانی میں متعدد تحقیقی مقالے قلم بند کئے گئے ہیں جن میں سے درج ذیل شائع ہو چکے ہیں۔

- ۱۔ اردو ناولوں میں ترقی پسندی از ڈاکٹر حیات افتخار (پی ایچ ڈی)
- ۲۔ اردو کی اخلاقی مثنویاں از ڈاکٹر ملکہ خورشید (”)
- ۳۔ قاضی بدرالدولہ، حیات اور کارنامے از ڈاکٹر سجاد حسین (ایم فل؛)
- ۴۔ تامل ناڈو کی اردو صحافت از ڈاکٹر عابد صفی (”)

۱۔ نصیر الدین ہاشمی: کتب خانہ آصفیہ کے مخطوطات: ص: ۳۸
غوثی آرکاٹی پر ناچیر کا ایک تفصیلی مضمون زیر ترتیب ہے۔ نویدی

- ۵۔ والا جاہی خاندان کے تین شاعر از ڈاکٹر پروین فاطمہ (ایم فل)؛
- ۶۔ پریم چند کے افسانوں میں طبقاتی کشمکش از احمد ندیم (ایم اے)؛
- ۷۔ نواب محمود حیات اور کارنامے از محمد عبید الرحمن (ایم فل)؛
- ان کتابوں کے مصنفین میں بحیثیتِ نثر نگار بعض کے نام گونا گونا انہوں نے مناسب نہیں سمجھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے یہ قلم کار علیم صاحب کی نظر میں درخور اعتنا نہیں ہے۔
- تحقیق میں کسی چیز کو حرفِ آخر کہا جاسکتا ہے اور نہ کبھی تحقیق کے دروازے بند ہوتے ہیں۔ یہ کام آنے والے محققین کا ہے کہ وہ مختلف نثر نگاروں کی تحریری کاوشوں کا سراغ لگائیں اور انہیں اردو کے وسیع تر حلقے سے روشناس کرائیں۔ دوسرے مضمون میں تامل ناڈو میں اردو افسانے کے آغاز اور ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے علیم صبا نویدی نے لکھا ہے کہ تامل ناڈو میں شاعری کے مقابلے میں افسانے کی صنف کی جانب خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ اسی لیے اس سرزمین سے کوئی عظیم المرتبت افسانہ نگار منظر عام پر نہیں آیا۔ لیکن یہاں کے حالات اور ماحول کے پیش نظر جتنے بھی اور جیسے بھی افسانے نگار یہاں سے ابھرے ہیں انہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس مضمون میں علیم صبا نے تامل ناڈو کے سترہ فن کاروں کی افسانہ نگاری کا سیر حاصل تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ جس سے ان کی ژرف نگاہی اور مطالعہ کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس مضمون کے مطالعہ سے دو باتیں ذہن میں آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ علیم صبا نویدی اگر پہلے مضمون کا عنوان ”تامل ناڈو میں اردو نثر“ قرار دیتے ہوئے تمام نثر نگاروں کا مفصل جائزہ لیتے تو یہ ایک جامع اور مبسوط مقالہ بن جاتا۔ موجودہ صورت میں اس مضمون (تامل ناڈو میں اردو افسانہ) میں درج ذیل افسانہ نگاروں کے نام شامل ہونے سے رہ گئے ہیں۔

نورس خیامی، انور ربانی، عبدالعزیز عادل، دوسرے یہ کہ غالب
مضمون نگار ہونے کی حیثیت سے علیم صبا نے بحیثیت افسانہ نگار اپنے نام کی
شمولیت کو غیر ضروری سمجھا۔ حالانکہ وہ تامل ناڈو کے ایک باکمال افسانہ نگار ہیں
اور ان کے افسانوں کے تین مجموعے ”روشنی کے بھنور“، ”شگاف در شگاف“ اور
”و ا جلی مسکراہٹ“ شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔

تیسرا مضمون تامل زبان کے جدید افسانہ نگاروں کے اجمالی تذکرے
پر مبنی ہے۔ تامل زبان دنیا کی قدیم ترین زبانوں میں سے ایک ہے اور اس کا ادبی
سرمایہ جتنا قدیم ہے اتنا ہی عظیم بھی ہے۔ اس مضمون میں علیم صبا نے تامل زبان
کے تیرہ جدید اور قدآور افسانہ نگاروں اور ان کے فن کو اپنی اردو سے متعارف
کروانے کی قابل قدر اور قابل تقلید کوشش کی ہے۔

دوسرے زمرے کے مضامین لطیف آرکاٹی، نواب تاجمل حسین خان
ایمان، شاہ عبدالحیٰ احقر اور مولانا فدوی باقوی سے متعلق ہیں۔ لطیف آرکاٹی غالب
کا ہم عصر اور غلام غوث خان اعظم کے دور (1820ء تا 1855ء) کا ایک خوش گو شاعر تھا
علیم صبا نے اپنے مضمون میں لطیف آرکاٹی کے کلام کی اندرونی شہادتوں کی مدد سے اس
کے واقعاتِ حیات کے بعض نئے گوشوں کو روشن کرنے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ
لطیف کے ہم عصر شاعروں کا تذکرہ کرتے ہوئے شمالی ہند کے بعض شعراء بہادر شاہ ظفر
مرزا غالب، حکیم مومن خان مومن کی زمینوں میں لطیف کی کہی ہوئی غزلوں کی نشان دہی
کی ہے اور تذکرہ شعرا کے کلام سے ایسے اہم مضمون اشعار بھی پیش کئے ہیں۔ جنہیں لطیف
نے بھی اپنے کلام میں باندھا ہے۔ دوسرا مضمون جلال لکھنوی کے شاگرد اور جنوبی ہند
کے علاقے میں دبستان لکھنوی کی نمائندگی کرنے والے شاعر نواب تاجمل حسین ایمان گویا مونی
کے بارے میں ہے۔ اس مضمون میں علیم صبا نویدی نے ایمان کی زندگی کے واقعات اور

ان کی شاعری کی خصوصیات پر سرسری نظر ڈالی ہے۔ اول الذکر مضمون کے مقابلے میں یہ مضمون نہایت مختصر ہے۔ اگر اس مضمون میں ایمان کے حالات زندگی اور ان کے ادبی کارناموں کا تفصیلی جائزہ لیا جاتا تو زیادہ بہتر تھا۔ اس سلسلے کا تیسرا مضمون مولانا عبدالحی احقر کی علمی، دینی اور ادبی خدمات کے بارے میں ہے۔ شاہ عبدالحی احقر المعروف بہ واعظ بنگلوری (۱۲۳۲ھ - ۱۳۱۸ھ) ۱۸۸۲ء) اپنے وقت کے ممتاز عالم دین ہونے کے علاوہ ایک کثیر التصانیف ادیب اور شاعر بھی تھے۔ ان کی تصانیف کی تعداد سو سے اوپر بتائی جاتی ہے۔ اس مضمون کے آغاز میں علیم صبا صاحب نے جنوبی ہند میں عموماً اور میسور میں خصوصاً اردو کے عہد بہ عہد نشوونما پر سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے سلطنتِ خداداد کے قیام کے بعد عہدِ حیدری (۱۷۶۱ء - ۱۷۸۲ء) عہدِ ٹیپو سلطان (۱۷۸۲ء - ۱۷۹۹ء) سے لے کر چاراج اوڈیار کے دور (تحتِ نشینی ۱۸۶۸ء) تک کے اہل قلم حضرات کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا احقر بنگلوری کے واقعاتِ حیات اور ان کی دینی، مذہبی اور علمی و ادبی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ علیم صبا نویدی کا یہ مضمون نہایت جامع اور پُر از معلومات ہے۔

چوتھا مضمون ”پروفیسر غلام حسین دلیل اور نظم کائنات ہے“ جس میں علیم صبا صاحب نے پروفیسر دلیل کے واقعاتِ حیات، شخصیت اور ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کا مفصل جائزہ لیا ہے۔

اس سلسلہ کا پانچواں مضمون مولانا قدوسی باقوی کے بارے میں ہے مولانا قدوسی جنوبی ہند کی مشہور و معروف دینی اور علمی درس گاہ ”باقیات الصالحات“ سے فیض حاصل کیا ہے۔ ان کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ مولانا نے نوجوان شاعروں اور ادیبوں کی ایک نسل کی فتنی اور فکری اعتبار سے آب یاری کی ہے۔ ان کی

تربیت یافتہ نسل نے علم و ادب کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دے دیے ہیں ان کی اہمیت روز افزوں بڑھتی ہی جائے گی۔ فدوسی باقوی صاحب کی ادبی شخصیت کے مختلف گوشوں کو منور کرتے ہوئے علیم صبا نویدی نے لکھا ہے کہ مولانا فدوی نہ صرف ایک باکمال شاعر ہیں بلکہ نثر نگاری کے میدان میں بھی انھیں یدِ طولیٰ حاصل ہے۔ اگرچہ کہ انہوں نے شاعری کے کم و بیش تمام اصناف کو اپنی طبع کا موضوع بنایا ہے لیکن بحیثیتِ مجموعی ان کی شاعری کے جوہر صنفِ رباعی میں کھلتے ہیں۔ مولانا فدوی نے افسانہ نگار اور نقاد کی حیثیت سے بھی اپنی علمی اور ادبی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن تعجب اس بات کا ہے کہ ایک طرف کچھ تو ان سے فیض حاصل کرنے والوں نے نثری شاگردی ادا کرنے میں تساہل سے کام لیا ہے اور دوسری طرف ہمارے نقادوں نے بھی مولانا کی ادبی شخصیت کو منظرِ عام پر لانے کی خاطر خواہ کوشش نہیں کی۔

تیسرے زمرے کے مضامین، علیم صبا نویدی کے قلم بند کئے ہوئے ہیں۔ انھوں نے کرناٹک، اور تامل ناڈو کے قلم کاروں کی کتابوں کے مقدموں یا تعارف ناموں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سلسلہ کا پہلا مضمون راہی فدائی کی کتاب ”کدپہ میں اردو“ (مطبوعہ 1992ء) پر علیم صبا کا تحریر کیا ہوا ”تعارف“ ہے۔ جس میں علیم صاحب نے مولانا راہی کی شخصیت اور شاعری کا ان کے مخصوص دینی اور علمی پس منظر میں تجزیہ کرتے ہوئے ان کی تازہ نثری تصنیف ”کدپہ میں اردو“ کو مولانا کا ایک اہم تحقیقی اور تنقیدی کارنامہ قرار دیا ہے۔

اس قبیل کا دوسرا مضمون ”صنفِ دوہا اور ساغر جیدی“ دراصل ساغر جیدی کے مجموعے ”ثروت“ (سہم) پر علیم صاحب کا تحریر کیا ہوا مقدمہ ہے اس مضمون میں صبا نویدی نے صنفِ دوہا کے آغاز اور اس کی نشوونما پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو ادب کے باکمال شاعر ساغر جیدی کے دوہوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ علیم

لکھتے ہیں کہ ساغر جیدی کے دوہوں میں ہندی لفظیات کے بجائے فارسی اور عربی الفاظ کے امتزاج سے دوہوں کی صنف کو ایک نیا رنگ و آہنگ اور ایک نئی تہ و تاب نظر آتی ہے۔

اس سلسلہ کا تیسرا مضمون ڈاکٹر راہی قریشی کے مجموعہ کلام ”عکس کی ہجرت“ کے بارے میں علیم صبا کے تاثرات پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر راہی کرناٹک کے ایک باکمال شاعر ہی نہیں بلکہ گلبرگہ یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے ایک سینئر استاد بھی ہیں۔ ڈاکٹر راہی کی شاعری کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے علیم صبا صاحب نے لکھا ہے کہ راہی قریشی کے کلام میں روایت کی پاس داری کے ساتھ ساتھ جدید لب و لہجہ کی کھنک انھیں اپنے معاصر شعراء میں ایک نمایاں اور منفرد مقام عطا کرتی ہے۔ ڈاکٹر راہی اپنے کلام میں نینہ اور چراغ کے الفاظ کے حسین استعمال سے معنی کی ایک سے زائد سطحوں کو روشن کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

چوتھا مضمون میسور کے مشہور شاعر اکرام کاوش کے مجموعہ کلام ”اب زندہ“ کا تعارف نامہ ہے۔ اس میں نویدی صاحب میسور میں اردو ادب کی ابتدائی نشوونما پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ سلطنتِ خداداد کے قیام سے پہلے بھی یہاں اردو میں تصنیف و تالیف کے کام کا آغاز ہو گیا تھا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے عبدالمومن اور شاہ صدر الدین کا ذکر کیا ہے اور پھر سلطنتِ خداداد کے عہد سے لے کر عہدِ حاضر تک کے شعراء اور ادیبوں کے کارناموں کے علاوہ میسور کے بعض علمی و ادبی اداروں کا بھی تذکرہ کرتے ہوئے اکرام کاوش کی نظموں کا تجزیاتی جائزہ لیا ہے۔

پانچواں مضمون بنگلور کے مشہور ادیب و شاعر عبدالقادر ادیب سے متعلق ہے۔ اس مضمون میں بھی علیم صاحب نے عبدالقادر ادیب کی انشائیہ نگاری کی خصوصیات کو ضبطِ تحریر میں لانے سے پہلے اردو کے اہم انشائیہ نگاروں کا ذکر کیا ہے اور

پھر ادیب کی شخصیت اور فن کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔

”جنوب کا شعر و ادب“ کا آخری مضمون تامل ناڈو کے نامور ادیب

یعقوب اسلم کے افسانوں کا مجموعہ ”چہروں کی دیوار“ (1980ء) کا پیشِ لفظ ہے۔
 یعقوب اسلم تامل ناڈو کے افسانہ نگاروں میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں ان کی افسانہ
 نگاری کی فنی جہتوں پر علیم صبا نویدی نے بڑے سلیقے سے روشنی ڈالی ہے۔

اس کتاب کی اشاعت اس بات کو منصفہ شہود پہلاتی ہے کہ علیم صبا نویدی
 کے اہلِ قلم نے شاعری کے علاوہ تحقیق و تنقید کے میدان میں بھی اپنی جولانی دکھائی
 ہے۔ یہ امر بطورِ خاص داد کا مستحق ہے کہ انہوں نے جنوبی ہند کے نثر نگاروں اور شاعروں
 کو عموماً اور تامل ناڈو کے ادبی سرمایے کو خصوصاً منظرِ عام پہ لانے اور جدید قلم کاروں کو
 اردو دنیا سے متعارف کروانے کی اہم اور قابلِ قدر فریضہ کو بڑی ذمہ داری کے ساتھ
 انجام دیا ہے۔

محمد علی اسلم

ڈاکٹر محمد علی اسلم

۶ جون ۱۹۹۳ء



شہرِ مدراس میں اردو نشر کا ارتقاء

شہرِ مدراس میں اردو نشر کا تقریباً تین سو سالہ طویل سفر مذہبی، علمی اور ادبی رجحانات کا حامل رہا ہے۔ اس دور کا علمی سرمایہ تصوف کے نورانی پرتو کے زیرِ اثر تھا۔ سرزمینِ مدراس میں جن بزرگانِ دین نے اردو زبان و ادب میں تصنیف و تالیف کا کام کیا ہے ابتداءً اُن کے پیشِ نظر زبان و ادب کی ترویج کی بجائے مذہب اور تصوف کی نشر و اشاعت کا کام تھا اور وہ عوامی بول چال اور عام لوگوں کی زبان لے کر عوام الناس تک پہنچنا اور اپنی بات ان لوگوں تک پہنچانا چاہتے تھے۔

شہرِ مدراس میں اردو نشر کی شروعات حضرت شاہ سلطان (ولادت 609ء) کی تصانیف ”دُرُ الاسرار“ اور ”زنجیرہ“ سے ہوتی ہے۔ آپ کے والد کا

لے یہ دونوں کتابیں ادارہ ادبیاتِ اردو، حیدرآباد میں موجود ہیں۔

سید فخر الدین سلطان حسینی تھا۔ حضرت شاہ سلطان سلسلہ بندہ نواز کے بزرگوں میں سے ہیں۔ آپ کی مذکورہ دونوں کتابیں قدیم اردو میں تصوف کے موضوع پر مرقوم ہیں۔ اس کے بعد سید شاہ عبدالقادر معروف بہ میراں شاہ ولی اللہ منزوی الجبلین (وفات 1146ھ م 1733ء) کی تصنیف ”خلاصۃ الرویت“ ہے۔ اس کتاب میں تصوف کے مسائل کی تشریح بہت سیدھی سادی اور عام فہم زبان میں ملتی ہے۔ ان تصانیف کے علاوہ حضرت شیخ محمد مخدوم عبدالحق ساوی عرف حضرت دستگیر صاحب (وفات 1165ھ م 1752ء) کا رسالہ ”مفتاح الکمل“ (جو تصوف پر دکنی اردو میں ہے) حضرت سید شاہ ابوالحسن قرنی (وفات 1182ھ م 1769ء) کا ”رسالہ تصوف“، حضرت باقر آگاہ (وفات 1220ھ م 1805ء) کی تصنیف ”ریاض السیر“ اور مختلف رسائل کے نثری دیباچے (جو زبان کے قواعد کی بحث پر مشتمل ہیں) حضرت مولانا مولوی محمد غوث شرف الملک بہادر (وفات 1238ھ م 1822ء) کی کتاب ”ترجمہ کیدانی“ حضرت سید شاہ ابوالحسن قادری محوی (وفات 1243ھ م 1827ء) کا ”رسالہ تفصیل المراتب فی احوال المراتب“ و دیگر رسائل تصوف، قاضی بدرالدولہ محمد صبغتہ اللہ (وفات 1280ھ م 1863ء) کا ”ریاض النوان“ و دیگر کتب دینیہ اور میر مہدی واصف (وفات 1290ھ م 1873ء) کے مختلف النوع تصانیف اور تراجم سے ملنا ڈوبیں اردو نشر کا تاریخی

۱۔ مل ناڈو میں اردو نشر کا ارتقاء (غیر مطبوعہ) ڈاکٹر سید صفی اللہ
 ۲۔ اس کتاب کا نسخہ اور کنٹریل ریسرچ انسٹیٹیوٹ مقام میں محفوظ ہے۔
 ۳۔ اس کتاب کا ایک نسخہ کتب خانہ محمدی میں موجود ہے۔
 ۴۔ کتب خانہ لطیفیہ ویلور میں محفوظ ہے۔

سفر جس خوش گواری، شادابی اور بھرپور آب و تاب کے ساتھ جاری تھا وہ خالص دکنی پیرائے سے دکنی اردو کے پیرائے اظہار میں منتقل ہو کر حضرت سید شاہ عبدالغفار مسکین (وفات 1326ھ م 908ء) کی شرح ”من لکن“ (از بحری) حضرت محمد بدیع الدین فاروقی (وفات 1959ء) مدیر ”مورخ“ مدراس کے مضامین اور تراجم، محمد اسماعیل سیٹھ مغنوم (وفات 1348ھ م 929ء) کا سفرنامہ ”ارمغانِ کلکتہ“ اور دیگر مذہبی و دینی مضامین۔ حضرت نواب تجمل حسین خان ایمان گویا موی (وفات 1354ھ م 1935ء) کی تقریباً ایک درجن کتابیں منصفہ شہود پر آچکی ہیں، سبھی کتابیں مذہبی موضوعات پر بڑی شگفتہ اور نکسالی زبان میں ہیں۔ ان تمام تصانیف میں موصوف کی معرکتہ الآرا، نادر اور نایاب تصنیف ”پردہ“ ہے۔ محمد منور خان گوہر مدراسی (وفات 1361ھ م 1941ء) کا تاریخی اور تحقیقی کارنامہ ”تذکرہ شعرائے دکن“ (سختور ان بلذ فکر) (جلد اول مطبوعہ 1936ء اور جلد دوم مطبوعہ 1953ء) ٹمل ناڈو کی اردو نشر کی تاریخ کو ہمیشہ روشن کوئی رہیں گی۔

محمد منور خان گوہر مدراسی کی مذکورہ تالیف نے جہاں شہر مدراس کے نثری ادب کو ایک نئے انقلابی اور ادبی ذائقے سے آشنا کیا ہے وہیں مولانا رحیم احمد فاروقی (وفات 1966ء)، مولانا ابوبکر نظلی، مولانا ابوالجلال ندوی، علامہ شاگر ناتلی کے علمی، تحقیقی، تنقیدی بصیرت افروز مضامین اور ادبی تذکرے، ڈاکٹر عبدالحق کا سفرنامہ ”اطالیہ“ اور مجموعہ مضامین ”انشاء حق“ اور شرر آلندوری اور مولانا حبیب خان سرودش داؤدی کی علمی اور معلوماتی تحریروں نے مدراس میں اردو نشر کی فضا کو ایک گوتہ رنگ و نور سے مزین و آراستہ کیا ہے۔

جنگ آزادی کے بعد شہر مدراس میں اردو نشر کا چلن اور بھی عام ہوا جس طرح نظم میں طبع آزمائی کی جاتی تھی اُسی طرح نثری تخلیقات کی طباعت بھی

پُر زور طریقے پر ہوی۔ یہاں اس دور کے اہم اور ممتاز شہنشاہوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ جنہوں نے شہرِ مدراس ہی نہیں بلکہ سارے مملکتِ ناٹو کے اردو کے جغرافیائی نقشے کو اپنی تمام تر ذہنی توانائیوں اور تالیفوں سے سیراب و شاداب کیا ہے۔

مولوی سید ابوالبرکات النور | آپ ایک عرصہ تک روزنامہ ”آزاد ہند“ اور روزنامہ ”مسلمان“ میں

صحافتی خدمات انجام دیتے رہے۔ موصوف کے اکثر و بیشتر ادارے ”نوائے وقت“ لاہور کے کالم ”مانگے کا اُجالا“ کی زینت بنتے رہے۔ آپ کے سیاسی، علمی اور مذہبی تحریریں آج بھی مسلمان کے صفحات پر محفوظ ہیں۔

سید سلطان محی الدین بھینی | موصوف روزنامہ ”ہمدرد“ مدراس کے مدیر تھے۔ تیر و نشتر کے تحت آپ

کا لکھا ہوا حالاتِ حاضرہ پر تبصرو آپ کی خاص پہچان بن چکے ہیں۔ آپ کی ادارت میں ایک دینی ماہ نامہ ”امام“ بھی منظرِ عام پر آچکے ہیں جس میں مذہبیات پر موصوف نے بڑے جان دار مضامین لکھے ہیں۔

محمد یوسف کوکن عمری | آپ کثیر التصانیف قلم کار ہیں۔ آپ نے متعدد انگریزی اور عربی

کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ آپ کی کتابوں میں امام ابن تیمیہ بہت ہی ضخیم اور متنوع ذریعہ کتاب ہے۔ موصوف کی تحریروں میں ایک طرح کا ثقل اور ایک گونہ خشکی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے قاری پر اس کا تاثر برائے نام ہی ہو پاتا ہے لیکن آپ کی تحریریں مواد اور معلومات کے لحاظ سے بہت جان دار اور وسیع ہوتی ہیں۔

آپ ایک صاحبِ اسلوب نثر نگار
تھے۔ آپ کے علمی، ادبی، دینی

سید عظمت اللہ سردی

موضوعات پر بہت سارے مضامین ”مسلمان“ ”مدرس“ ”شاگرد“ ”مدرس کے علاوہ
دینی رسائل میں جگہ پانچکے ہیں۔ آپ نے صحافت میں بھی کام کیا ہے نمایاں انجام دے
آپ کو مختلف علوم سے واقفیت کے ساتھ اردو زبان و بیان پر خاص قدرت بھی حاصل
تھی۔ مطالعہ وسیع ہونے کی وجہ سے آپ کی نثری تحریریں بڑی معلومات افزا
ہوتی تھیں۔ آپ کے مضامین کی زبان تصنع اور حشو و زوائد سے پاک ہوتی تھی۔

آپ بنیادی طور پر طنز و مزاح نگار
تھے۔ آپ بھی ہفت روزہ ”شاگرد“

جی۔ بی۔ خان سرور و داؤدی

مدرس میں بالالتزام کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ آپ نے اپنی زندگی ہی میں اپنے مضامین
کو یکجا کر کے پروفیسر احتشام حسین سے مقدمہ لکھوایا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ موصوف
کی وفات کے بعد بھی ان کے ورثا میں کسی کو اس کی اشاعت کی توفیق نہیں ہوئی واقعہ
یہ ہے کہ شہر مدرس میں مزاح نگاری میں اس قدر بلند و بالا مقام کا حامل کوئی اور فنکار
تاحال پیدا نہیں ہوا۔

موصوف ہندی اور اردو کے شاعر
ڈرامہ نویس اور ناول نگار ہیں، آپ

عبد العزیز عادل

کی زبان شستہ اور شائستہ ہے۔ کئی نصابی کتابیں ترتیب دی ہیں۔ ”فن
بلاغت“ پر بھی آپ کی کتاب ”سخن فہمی“ ہفت روزہ ”رفیق ملت“ مدرس میں
قسط وار شائع ہو چکی ہے۔ آپ نے ایک طویل ناول ”دولت کی بھینٹ“ بھی

شد الخیری کے معاشرتی رنگ میں تھا، لیکن افسوس ہے کہ یہ ناول طباعت سے آراستہ نہ ہو سکا۔

لی خان جید

موصوف کا تعلق خاندان والا جاہی سے تھا۔ آپ نے ڈاکٹر عبدالحق کرونولی

محمد فاروقی آزاد مرحوم سے بھرپور استفادہ کیا۔ مدراس کی شعری بنائے رکھنے میں بہت اہم رول ادا کیا تھا۔ بحیثیت شنگار آپ ن مضامین ”فانوس خیال“ ماہ نامہ ”منزل“، ”امام“ اور ہفت روزہ شائع ہو چکے ہیں۔ زبان میں سادگی اور رکھ رکھاؤ آپ کے اسلوب خصوصیات ہیں۔

شنا محبوب

موصوف کا تعلق نوابانِ آرکاٹ

سے ہے۔ آپ نے اس خاندان کی

دینی خدمات پر بڑے معلومات انگیز مضامین لکھے ہیں جو ٹمل ناڈو میں آپ کی شناخت قائم کر چکے ہیں۔ آپ کی تحریروں کی زبان سادہ۔ آفریں ہوتی ہے۔ آپ نے تحقیق اور تاریخ ادب کو زندگی بھر اپنا یقین ہے کہ اس لہو کا ہر قطرہ موصوف کو ٹمل ناڈو کے ادبی شہ زندہ رکھے گا۔

رازِی

حضرت دانش فرازی مرحوم کا تعلق اگرچہ ضلع شمالی آرکاٹ سے تھا۔ لیکن موصوف

زین حصہ شہر مدراس کی ادبی فضا کی نذر رہا۔ آپ بنیادی طور پر

ایک ہمد آفریں شاعر تھے۔ آپ نے جو نثری تحریریں اردو ادب کو دی ہیں وہ آج بھی ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ ٹمل ناڈو کے شعراء پر آپ کے نغرافی خاکے (رسالہ ”فروغ ادب“ دامنیاڑی میں) ہمارے آئندہ کے مؤرخ اور محقق کے لیے ایک انمول خزانے کا درجہ رکھتے ہیں۔ موصوف کے علمی ادبی اور فکری روشن اُفتق کے نیچے سانس لینے والوں میں متعدد شخصیات ہمارے درمیان موجود ہیں جو بظاہر موصوف کے نام سے خود کو منسوب کرنے سے گریز کرتی ہیں۔

کاوش بدری | حضرت کاوش بدری کا تعلق بھی ضلع شمالی آرکاٹ سے ہے لیکن موصوف کی ذہنی اور ادبی پرورش و پرداخت میں شہر مدراس کی فضا نے بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ آپ ٹمل ناڈو کے ممتاز شاعر، محقق اور نقاد ہیں۔ آپ کی نثری تحریریں طویل ہونے کے باوجود اپنے دامن میں ”معلومات جزویہ“ اور ”افادات فیضیہ“ کی ہبک لیے ہوئی ہوتی ہیں۔ آپ نے ماہ نامہ ”فن کار“ اور ”منزل“ کے ذریعہ اردو ادب میں نہ صرف اپنی پہچان قائم کی بلکہ شہر مدراس کے شعراء اور ادباء کی تخلیقی کرونوں کو شمالی ہند کے فن کاروں کے ذہن تک پہنچانے کا وہ کارنامہ انجام دیا ہے جس کو ٹمل ناڈو کی اردو ادبی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

موصوف کی شخصیت اور آپ کا فن
دونوں ٹمل ناڈو کی اردو دنیا میں

محی الدین عارف |

محتاجِ تعارف نہیں۔ یہ وہ زندہ دل فن کار ہے جس سے اردو کی تنقیدی دنیا کو بہت سے امکانات وابستہ تھے لیکن افسوس ہے کہ عین جوانی میں ملک الموت کی دعوت پر اس نے اردو دنیا کو آخری سلام کیا۔ ہنگامی مضامین لکھنے میں موصوف کو کمال حاصل تھا۔ کئی ایک تنقیدی مضامین ”شعلہ و شبنم“ دہلی میں شائع ہو چکے ہیں۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں ماہ نامہ ”جلت رنگ“ کی ادارت سنبھالی اور کئی علمی اور ادبی ہنگامے برپا کئے۔ ٹل ناڈو کے بعض رسائل کے پس منظر میں نیک نیتی سے ادارتی فرائض انجام دینے والی باغ و بہار شخصیت کا ایک نام عارف مدراسی بھی تھا۔

آپ ٹل ناڈو کے ممتاز صحافی،

قد آور شاعر اور منفرد نثر نگار ہیں

راز امتیاز

آپ نے اردو ادب کو وہ سب کچھ دیا جو ایک حساس اور آفاق گیر قلم کار دے سکتا ہے۔ آپ کی تحریروں میں متانت، ذہانت اور وضع داری کے نقوش بدرجہ اتم موجود ہیں۔ آپ نے اردو ادب کے جس موضوع کو بھی چھوا ہے اس کا حق ہی ادا نہیں کیا بلکہ اس موضوع کو نور علی نور بنا دیا ہے۔ افسانوی ادب بھی موصوف کی ذہنی وسعتوں سے بھرپور آشنا ہے۔ آپ کی صحافتی خدمات کا اعتراف بھی ادبی اور سرکاری طور پر کیا جا چکا ہے۔ ”ہندوستانی اردو صحافت“ پر آپ کا مضمون (روزنامہ ”علمبردار“ بنگلور، مطبوعہ ۱۹۸۴ء) تاقیامت تاریخ اردو صحافت میں اپنے روشن خدو خال کے ساتھ یاد رہے گا۔

یہ وہ دو منفرد افسانہ نگار ہیں جنہوں نے سب سے پہلے

ادیب بھارتی اور فریبی

اور نئے انداز کے افسانوں کی بنیاد ٹمل ناڈو میں رکھی۔ ان دونوں افسانہ نگاروں کے مختصر افسانوں کا دور اس شان و شوکت سے شروع ہوا کہ ان کے پیچھے راقم الحروف کے علاوہ بہت سے نوجوان افسانہ نگاروں نے بھی اپنی بہترین صلاحیتوں کے جوہر دکھائے اور مختصر افسانہ نگاری کے مدار میں آج بھی جلوہ فشاں ہیں۔ ادیب اور فرحت دونوں کے افسانے ہفت روزہ ”فلم دلش“ مدراس، پندرہ روزہ ”روپ“ مدراس اور ماہ نامہ ”پاکیزہ“ مدراس میں شائع ہو چکے ہیں۔ ادیب بھارتی کا ایک افسانوی مجموعہ 1967ء میں کتابت کی منزل سے گزر چکا تھا۔ نہ جانے کن وجوہات کی بناء پر وہ طباعت کا منہ نہ دیکھ سکا۔ اگر ادیب کا یہ مجموعہ منظر عام پر آجاتا تو ٹمل ناڈو کے افسانوی ادب میں یقیناً ایک اضافے کی حیثیت رکھتا۔

یہ دونوں فن کار ایک دوسرے کے ہم جماعت

سعد اللہ ممتاز اور راجی صدیقی

ہونے کے ساتھ ساتھ ہم نوالہ اور ہم پیالہ بھی تھے۔ ممتاز کا زیادہ تر چھان اردو شاعری اور مضمون نگاری کی طرف تھا تو راجی صدیقی کا طبعی میلان شاعری اور افسانہ نگاری کی طرف۔ ان دونوں فن کاروں کی نثری اور شعری تخلیقات ٹمل ناڈو کے مقتدر رسائل ”معیار ادب“ و ”شارم“ ”مشعل“ اور ”پاکیزہ“ مدراس میں جگہ پا چکی ہیں۔ ان دونوں فن کاروں کے نثر پارے ایک عجیب کشش انگیز کیفیات سے مملو تھے

آپ ایک خاموش طبع مگر خوش فکر
نثر نگار تھے۔ آپ نے ابتداً طبع زاد

بس۔ یم۔ حیات

افسار نے لکھے اور بعد میں تراجم کی طرف مائل ہوئے تو بس اسی کے ہو کے رہے۔ ٹل، ملیا لم، بنگالی اور اوریہ (Oriya) زبانوں کے شاہکار افسانوں کا ترجمہ اردو زبان میں اس اچھوتے اور کٹھن انگیز انداز میں کیا ہے کہ ترجمہ پر تخلیق کا گماں ہونے لگتا ہے۔ ہندوپاک کے افسانوی ادب میں آپ کی ایک خاص شناخت قائم ہو چکی ہے۔ آپ کے تراجم ہندوپاک کے کثیر الاشاعت رسائل میں شائع ہو چکے ہیں ان کے تراجم کا ایک مجموعہ ”وینگ روم“ فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی، حکومت اتر پردیش کے مالی تعاون سے شائع ہو کر نراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔

آپ کے رومانی اور جاسوسی انداز کے
افسانے مدراس کے متعدد رسائل کی

نورس خیامی

زینت بن چکے ہیں۔ آپ افسانہ نگار سے زیادہ شاعر کی حیثیت سے مدراس کی فضا میں کافی مقبول ہیں۔ حضرت کاوش بدری کی معیت میں آپ بھی اردو ادب کی دنیا بہت زیادہ ہنگامے برپا کر چکے ہیں۔

آپ شہر مدراس کے ماحول کے خاص الخاص
ادبی ماحول میں ناول نگار کی حیثیت سے

کے آر حسینی

جانے پہچانے جاتے ہیں۔ آپ کا ناول ”ننگا ماحول“ 1958ء میں حیدرآباد سے شائع ہوا۔ اس ناول میں حسینی نے عورت کی بے بسی اور جنسی گمراہی کے خدو خال بڑے بہترین انداز میں اُجاگر کئے ہیں۔ اس ناول کی اشاعت کے بعد آپ ممبئی کی فلمی دنیا کی طرف رجوع ہوئے اور آج تک اس دنیا سے باہر نہ نکل پائے۔

یہ دونوں ٹمل ناڈو کے نمائندہ اور
 صفِ اول کے افسانہ نگار ہیں۔

رشید رشیدی اور عابد صفی

رشید نے افسانوں کے علاوہ دو ایک ناول بھی لکھے ہیں۔ ان کا ایک ناول ”ہمیرو“ مشورہ بیک ڈپو۔ دہلی سے منظر عام پر آچکا ہے۔ ”ہمیرو“ کے بعد موصوف کے ایک اور ناول کا مسودہ راقم الحروف کی نظر سے 96ء میں گزر چکا ہے۔ رشید کی زبانی یہ جان کر بے حد دکھ ہوا کہ شمال کے کسی اشاعتی ادارے نے ان کا یہ ناول غبن کر لیا ہے۔ رشید کے افسانوں اور ناولوں کا کینوس (Canves) بہت وسیع اور کشادہ ہوتا تھا۔ بالخصوص ان کے افسانوں کے کرداروں کا یہ کرشمہ ایک معرکہ سے کم نہیں ہے کہ وہ قاری کے سامنے اچھلنے کودنے اور بولنے لگتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس عابد صفی کے افسانوں کے ہلکے پھلکے موضوعات میں زندگی کی بعض سچائیوں کا رس اور تلخیوں کا عکس نمایاں ہوتا ہے۔ عابد صفی نے افسانوں کے علاوہ تنقید سی اور ادبی خالے بھی لکھے ہیں۔ آپ کی دو غیر مطبوعہ تصانیف ”ٹمل ناڈو کی اردو صحافت کی تاریخ“ اور ”ٹمل ناڈو میں اردو نشر کا ارتقاء“ آپ کی شخصیت اور فن کو سمجھنے میں مدد اور معاون ثابت ہوتی ہیں۔

یہ تینوں فنکار
 ٹمل ناڈو کی

مہر اور صبا مصطفیٰ، امیر الضیاء

بہترین افسانہ نگار ہیں۔ مہر اور صبا کے افسانے ہندوستان کے مقتدر رسائل میں جگہ پا چکے ہیں۔ انسانی نفسیات پر مہر اور صبا نے بڑی گہرائی اور ژرف نگاہی سے روشنی ڈالی ہے، اس کے برعکس امیر الضیاء نے اپنے معاشرے کی برائیوں کی نقاب

کشائی بڑے تیکے انداز میں کی ہے۔

اعجاز شاکری اور کاظم ناطلی

ان دونوں حضرات کے نام اور کام
ٹل ناڈو کے اردو ادب میں بہت

معتبر مقام رکھتے ہیں۔ 1975ء سے 1981ء تک جو جمود اور سکوت ٹل ناڈو کی ادبی
فضا پر چھایا ہوا تھا اس کو توڑنے اور بہت روزہ ”اتحاد“ کے ذریعہ شعری اور
نثری فضا کو دوبارہ معطر و منور کرنے میں خاص رول ادا کیا ہے۔ ان دونوں
حضرات کی ایماء پر راقم الحروف اور حسن فیاض کو اپنے اپنے تخلیقی جوہر دکھانے کے
مواقع بھی نصیب ہوئے۔ ٹل ناڈو کے اس دور کو واقعی اردو ادب کا جلوہ
نشانی دور کہا جاسکتا ہے۔ ان دونوں حضرات کے ادبی، تنقیدی مضامین
سوانحی خاکے اور افسانے روزنامہ ”اتحاد“، ”دراس“، ”روزنامہ سالار“ بنگلور میں
جگہ پا چکے ہیں۔ خاص طور پر راقم الحروف کے فن اور شخصیت کا بھرپور جائزہ لیتے
ہوئے لکھی ہوئی کتاب ”اچھ تراش“ کاظم ناطلی کی فکری، علمی اور تنقیدی
صلاحیتوں کی پہچان بن چکی ہے۔ اعجاز شاکری کے تبصرے، صحافتی مضامین
بھی ایک خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ جن کو اردو ادب کا محقق کبھی فراموش
نہیں کر سکتا۔

ان دونوں فن کاروں نے افسانوی

ادب کی دیواروں پر چند ایسی

انور ربانی اور حسن فیاض

ان دیکھی تصویریں چسپاں کی ہیں جن کے کاغذی پیرسین کے نقوش اردو ادب
میں ہمیشہ جاوداں رہیں گے۔ ان دونوں افسانہ نگاروں کی سوچ سے جو نئی کرنیں
پھوٹی ہیں وہ کاغذی دنیا کو روشن ہی نہیں کرتیں بلکہ ان کے افسانوں کے
قارئین کو نئے افسانے کے مزاج، نئی کیفیت، نئے زاویے اور نئی آفاقی

دوستوں سے بھی آشنا کرتی ہیں۔

آپ نے جس سنجیدگی اور متانت کے ساتھ طالب علمی کے دور میں

پروفیسر عبداللہ شاہ مدراسی

ادب کے میدان میں قدم رکھا آج بھی اسی نیک نامی کے ساتھ شہر مدراس کی ادبی فضا میں مشہور و معروف ہیں۔ ٹمل ناڈو کے اہم ترین شعراء پر آپ کے سوانحی خاکے سالنامہ ”فانوس خیال“ مدراس میں شائع ہو چکے ہیں۔ چند سال پہلے اپنے پیرومرشد حضرت حافظ سید حبیب محمد بن القادر چشتی کی زندگی کے واقعات اور مدراس کی اس عظیم ترین قبرک شخصیت کے کارناموں پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے ایک ضخیم کتاب ”حیات قلندری“ ترتیب دی ہے۔ موصوف کی یہ تالیف ان کی بہترین صلاحیتوں کی غماز ہے۔

ان تینوں حضرات کو ٹمل ناڈو کا

فیاض حسین۔ فضل جاوید اور فخر اعجاز

افسانوی ادب ہمیشہ یاد رکھے گا حالانکہ انہوں نے بہت کم افسانے لکھے ہیں مگر جو کچھ بھی لکھا ہے واقعی ادب کی بارگاہ میں ایک حسین تحفہ کی مثال ہے۔ ان تینوں افسانہ نگاروں کے افسانے مدراس کے جرائد اور کتب مثلاً ”گل نو“ (مطبوعہ 1967ء) ”روشنی کے بھنور“ (مطبوعہ 1967ء) پریسیڈنسی کالج، مدراس کے سالنامہ ”ضیا“ (مطبوعہ 1963ء تا 1965ء) وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ فیاض اور فضل جاوید کے افسانوں میں ہمارے معاشرے میں سانس لینے والی برائیوں کا عکس بڑے نرالے اور تیکھے انداز میں پایا جاتا ہے۔ فخر اعجاز کی ذہنی اور علمی تربیت حالانکہ مدراس کے ماحول میں ہوئی لیکن ان کے افسانے کشمیر کی حسین وادیوں اور جھرنوں کے

دھڑکتوں کے ساتھ ساتھ شملہ کی کوہستانی فضاؤں سے باتیں کرتی ہوئی خوشگوار
خوشبو سے لبس ہوتے ہیں۔

ٹمل ناڈو کا وہ اہم ترین فن کار ہے
جس نے نہ صرف اردو افسانوی ادب

صلاح الدین بَرَق

کو اپنی ذہنی تجلیات سے منور کیا بلکہ تراجم سے اردو زبان و ادب کے خزانے کو
بھی مالا مال کیا ہے۔ خاص طور پر خلیل جبران کے تراجم اردو زبان میں پیش کرنے
کا اعزاز برقی کو حاصل ہے۔ موصوف کے تراجم کی سب سے اہم خصوصیت
یہ ہے کہ ان کے تراجم پڑھتے وقت قاری کے رگ و پے میں شعری آہنگ اور
کلاسیکی رچاؤ کا احساس جالیاتی گزرتا ہے۔

شعیب احمد ٹمل ناڈو کی سرزمین سے
بڑی سرعت اور بلندہ وصلگی کے ساتھ

شعیب احمد کاف

اُبھرنے والا فن کار ہے۔ چند ہی سال کی مشق و مزاوت سے ہندوپاک کے بہترین
رسائل پر چھا جانے والی اور افسانوی ادب سے کم عمری میں روٹھ جانے والی بلغد
بہار شخصیت کو اردو ادبی دنیا ہمیشہ یاد رکھے گی۔ موصوف نے اپنے اکثر
افسانوں میں روزمرہ زندگی میں وقوع پذیر
واقعات کا ایک ہلکا
ساحل بڑے روشن اور نمایاں انداز میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ اپنی بات
کو بڑے دلکش اور خوش نما اظہار میں قاری تک پہنچانے کے فن سے شعیب
بہت خوب واقف تھے۔ اور یہی گراں کی کامیابی کی روشن دلیل ہے۔

لے شعیب نے ۷ اکتوبر ۱۹۹۱ء کو حرکتِ قلب بند ہوجانے کی وجہ سے وزنگل
حیدرآباد میں انتقال کیا اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔

غیاث اقبال

آپ ٹمل ناڈو کے باشعور و باصلاحیت
نقاد اور شنگار تھے۔ آپ کی نثر شہر

مراس کے تمام تر شنگاروں سے مختلف ہے۔ اس طرح کی اسلوبیاتی نثر ہندوستان
کے دو تین شنگاروں کے حصے میں آئی ہے۔ آپ کی تحریروں میں علمیت کے ساتھ ساتھ
ثقافت کا احساس قاری کے ذہن و دل کو اثر انگیزی سے باز رکھتا ہے۔ ہندوپاک کے
اکثر و بیشتر چرائد میں موصوف کی نگارشات شائع ہوتی رہی ہیں۔

مذکورہ بالا شنگاروں کے بعد راقم الحروف کا خیال ہے کہ ٹمل ناڈو میں اردو
نثر کے ایک دور کا اختتام بڑے شان دار پیمانے پر ہوا ہے اور اس دور میں جو بھی علمی
ادبی، تنقیدی، تحقیقی اور تالیفی کام ہوا ہے وہ ٹمل ناڈو کے اردو ادب کا بہت تا بندہ
اور درخشاں دور ثابت ہوا ہے۔ 1950ء سے 1990ء کے درمیان ٹمل ناڈو میں
تصنیف و تالیف کا کام بھی خوب سے خوب تر ہوا جس کا اعتراف ابھی کوئی کرے نہ کرے
آنے والا وقت ضرور کرے گا۔

آج کل نئے لکھنے والوں کی سی پ میں افتخار حیات، سجاد ظہیر، قاضی
حبیب احمد، امین الماس، احمد نعیم اور سجاد بخاری وغیرہم ہیں، جو شہرہ راس کے ادبی
افق کو اپنی تخلیقی کدو کاوش سے اردو نثر کو نئی روشنی دینے اور وسعت و کشادگی
کی مہک سے معطر کرنے کی کوشش میں مشغول ہیں۔

اسلامیہ کالج وائٹ ہاؤس، یوم اردو
میں پڑھا گیا مقالہ (1992ء)

لے ڈاکٹر غیاث اقبال نے دل کا دورہ پڑنے کے سبب

دسمبر 92 کو وفات پائی۔



ٹمل ناڈو میں اردو افسانہ

ٹمل ناڈو کا افسانوی ادب اپنی متنوع خصوصیات کی بنا پر قابل ذکر ہے لیکن عمر اور نشوونما کے اعتبار سے شاعری کے برعکس درخور اعتنا نہیں چونکہ ٹمل ناڈو کے فن کاروں نے جہاں شعری ادب اور نئے رجحانات کو لگن، انہماک اور دل چسپی سے اپنایا وہیں دوسری اصنافِ ادب سے قطع نظر افسانہ نگاری کی طرف بہت کم توجہ دی۔ افسانہ، ناول اور ڈرامہ نویسی کی اصناف نے کل ہند سطح پر ترقی کی جو مراحل طے کئے میری اپنی معلومات کے مطابق ٹمل ناڈو ان اصنافِ ادب کو اپنانے میں دوسری ریاستوں کی یہ نسبت بہت پیچھے ہی رہا۔

ٹمل ناڈو کی صد سالہ ادبی تاریخ کا تدریجی تجزیہ یہ کیا جائے تو راقم کا خیال ہے کہ پچھلے بیس، تیس سال کے عرصہ میں کوئی ایسا افسانہ نگار اس سرزمین سے نہیں ابھرا جس کو ہم کہیں چندر علی عباس حسینی، سعادت حسن منٹو، عصمت اور احمد ندیم قاسمی کی صف میں کھڑا کر سکیں۔ جتنی سچ دھج اور دھوم دھام سے

یہاں شاعری ہوئی ہے اس مقام کو افسانوی ادب نے نہیں چھوڑا۔ پھر بھی خوشی کی بات یہ ہے کہ یہاں کے بعض فن کاروں نے سنجیدگی کے ساتھ صنف افسانہ نگاری کو بھی اپنانے کی کوشش کی اور ان کی تخلیقات ہندوستان کے مقدر جرائد میں شائع بھی ہوئی ہیں۔

اس بات کا پتہ لگانا مشکل ہے کہ ٹمل ناڈو کا پہلا افسانہ نگار کون ہے؟ اردو کی یہ نسبت ٹمل کا افسانوی ادب اتنا اونچا اور معیاری رہا ہے کہ ٹمل افسانوں کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ خصوصاً میدان سیاست کے شہسوار اور دانائے راز آج بھانی شری راج گوپال چاری کے مختصر تامل افسانوں نے کافی مقبولیت حاصل کی اور کئی زبانوں میں ان کے افسانوں کے ترجمے بھی ہوئے۔ مشکل یہی ہے کہ تامل ناڈو میں اردو اور تامل فن کاروں کے درمیان نہ کوئی ادبی اشتراک ہے نہ کوئی فکری ہم آہنگی۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اکثر اردو کے فن کاروں کا یہ حال ہے کہ انہوں نے کبھی اردو ادب سے دل چسپی لی نہ ہی اس زبان کی تخلیقات سے استفادہ کرنے کا رجحان ان میں پیدا ہوا۔

تامل ناڈو کے اردو افسانوی ادب کی عمر زیادہ نہیں ہے، لیکن اس قلیل مدت میں بھی یہاں کے افسانہ نگاروں نے زمانہ کی بدلتی ہوئی قدروں اور تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے اپنی تخلیقات میں انفرادیت پیدا کی ہے جو یقیناً قابل تحسین ہے۔ انہوں نے اردو کو بہت کچھ نہ دیا ہو لیکن جو کچھ دیا ہے یہ سربا بہ بھی تامل ناڈو کے ماحول، حالات اور افتادِ طبع کے بیشِ نظر بہت غنیمت ہے ذیل میں چند افسانہ نگاروں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے :

ادیب بھارتی کو مرحوم لکھتے ہوئے خامہ
خون چکاں ہوتا ہے تو انگلیاں فگار... وہ

المتوفی
۱۹۷۱ء

زندہ دل باغ و بہار شخصیت کے مالک تھا۔ اس نے زندگی بھر اردو کی خدمت کی، فن کے حق کو پہچانا اور اپنی تخلیقات کو اپنے لہو کے ایک ایک قطرے کا حساب دیا۔ ادیب بھارتی تامل ناڈو کا پہلا فن کار ہے جس نے تند جذبات اور شدت احساس کے ساتھ نظم جدید کو اپنایا۔ دراصل پہلے وہ شاعر ہے اور بعد میں افسانہ نگار۔ اُس کے اندر جو افسانوی خصوصیات پنہائی تھیں وہ اس کی نظموں سے عیاں ہوتی ہیں۔ ایک وقت ایسا آیا کہ اس نے اپنے مزاج کی اُفتاد اور اپنی طبیعت کے تقاضے کو پہچانا پھر افسانہ نگاری کی طرف اس خطرناک حد تک توجہ دی کہ آخر کار افسانہ لکھتے لکھتے وہ خود ایک افسانہ بن گیا۔

راز امتیاز | راز امتیاز جہاں شاعر، صحافی اور نقاد ہیں، وہیں ایک افسانہ نگار بھی ہیں۔ اگرچہ

انہوں نے ایسے افسانے بھی اردو ادب کو دیے ہیں جن سے اُن کے ذہن و فکر اور فنی صلاحیت کا ثبوت ملتا ہے۔ راز امتیاز کے افسانوں میں نفسیاتی تحلیل کے ساتھ ایک ایسا لطیف عنصر بھی پایا جاتا ہے جس میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔ ان کے ذہن کی سطح پر سوچ کی جولانہ بھرتی ہے وہ بتدریج جانے پہچانے آفاق کو چھو جاتی ہے۔ راز امتیاز کے افسانے کے درجوں سے چھننے والی روشنی کبھی دھند کی شکل اختیار کرتی ہے تو کبھی صبح درخشاں۔ راز امتیاز ابلاغ خیال کے سلسلے میں ڈنڈا لے کر پیچھے نہیں پڑتے بلکہ ان کے احساسات موضوع کی ست رنگ بوتل میں خود بخود اترتے چلے آتے ہیں۔ راز امتیاز کے ذہنی پس منظر میں زندگی کا کرب بھی ہے اور نشاطِ غم بھی یقین ہے کہ اردو کا مستقبل راز کے سوا کت کے لیے خود آگے بڑھے گا۔

رشید دراسی

رشید مدراسی کی تخلیقات کی عمر بھی کافی
طویل ہے۔ وہ ایک زمانے سے لکھتے رہے

ہیں۔ ان کے طبع زاد افسانے بھی ہندوستان کے مقتدر رسائل میں جگہ پا چکے
ہیں۔ اور ان کے ناول ”ہیرو“ کو مشورہ بلڈ پو دہلی نے شائع کیا ہے جو کافی
مقبول ہوا ہے۔ انہوں نے جتنا بھی لکھا ہے اور جو کچھ بھی لکھا ہے اس کی افادیت
ہمہ گیری اور دل کشی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ موصوف کا اسلوب نگارش
نہ پریم چند سے ملتا ہے اور نہ کرشن چندر سے البتہ وہ دونوں کے بین بین ضرور
چلتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا موضوع اکثر رومانی رہا ہے۔

علی اکبر آمبوری کی شخصیت ناول ناڈو
کے افسانوی ادب میں سنگ میل کی

علی اکبر آمبوری |

حیثیت رکھتی ہے۔ انہوں نے ابتداء ہی سے اس صنفِ ادب کی طرف خاص توجہ
کی اور ان کے افسانے ہندوستان کے مقتدر رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ علی
اکبر آمبوری کے افسانوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خواجہ احمد عباس کے
اسلوبِ نگارش سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ جدیدیت کا اطلاق ان کے افسانوں
پر اس لیے نہیں ہوتا کہ یہ اس دور کی پیداوار ہیں جب کہ عباس، کرشن چندر اور
ان کے ہم عصروں کا ہنگامہ تھا۔ موصوف کی تخلیقات میں اگرچہ حیات و کائنات
کی ہم آہنگی اور ژرف بینی کے عناصر نہیں پائے جاتے لیکن افسانوی ماحول دل کو
چھو جانے والا ضرور ہوتا ہے۔ ان کے یہاں چونکانے والی کیفیت ہونے کے
باوجود اس میں وہ شدت نہیں ہے جو منٹو کے افسانوں میں پائی جاتی ہے۔
موصوف کے افسانوں کا مجموعہ ”برف سی اُجلی“ منظر عام پر آچکا ہے جو ناول ناڈو
کا سب سے پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔

ایس۔ ایم حیات طبع زاد افسانوں سے
زیادہ ترجموں کے سلسلہ میں بے حد

ایس۔ ایم حیات ۱

مشہور ہیں۔ انہوں نے تامل، انگریزی، ہندی، بنگالی اور ملیالی افسانوں کے ترجمے بکثرت کئے ہیں۔ لیکن ان کے ترجمہ شدہ افسانوں میں بھی اردو کا اپنا ایک خاص مزاج ملتا ہے۔ افسانہ پڑھنے کے بعد محسوس نہیں ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ ہے۔ طبع زاد تخلیق کی انفرادیت ان کے افسانوں میں جا بجا ملتی ہے۔ زبان اور فن پر بھرپور دسترس حاصل ہونے کی وجہ سے حیات نے اردو کے افسانوی ماحول کو بالکل سازگار بنایا۔

تامل ناڈو کی خواتین میں مہر طلعت آمبوری
کی ادبی شخصیت ہر اعتبار سے قابل ذکر

مہر طلعت آمبوری ۱

ہے۔ چونکہ مہر طلعت کا ماحول ادب، زبان اور ان کے دائرے سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اور پردے کی سخت پابندی کی وجہ سے ان کے مزاج میں جو گھٹن کی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے اس کے پیش نظر جب ہم ان کی تخلیقات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ایک حیرت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کیوں کہ قفس میں رہ کر بھی طاقت پرواز کی یہ شان ان کی انفرادیت کو اجاگر کرتی ہے۔ موصوفہ کے بعض افسانوں کے مطالعہ سے ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ شہ پارے کیا اُس ماحول کے پروردہ ہیں، جہاں قدم قدم پر پابندی ہی نہیں بلکہ فن کار کی آواز بھی پابہ زنجیر ہوتی ہے۔ ان کے افسانے ”شمع“ ”بسیویں صدی“، ”باتو“ اور دوسرے رسائل میں وقتاً فوقتاً چھپتے رہتے ہیں۔

عابد صفی

عابد صفی کا نام تامل ناڈو کے افسانوی
ادب میں سرِ فہرست نہ سہی لیکن آپ

نے دیکھتے ہی دیکھتے قلیل مدت میں ترقی کے مراحل تیزی سے طے کئے۔ عابد صفی
کے افسانے ”بیسویں صدی“، ”نیا دور“ اور دوسرے مقدر رسائل میں شائع
ہوتے رہتے ہیں۔ جمالیاتی عنصر ان کے افسانوں میں زیادہ پایا جاتا ہے مگر
اسی کے ساتھ زندگی اور کائنات کے سلسلہ میں عمق کا فقدان ہے۔ نہ انہوں
نے جدیدیت کو اپنایا ہے اور نہ ان کا زاویہ نگاہ رجعت پسندی سے تعلق رکھتا
ہے۔ میانہ روی ان کی تخلیقات کی اہم خصوصیت ہے۔ اگر وہ برابر لکھتے رہیں
اور دمانیت سے قطع نظر عصری تقاضوں، سماجی قدروں اور نئی کردلوں کو
بھی اپنی تخلیقات میں سمونے کی کوشش کریں تو یقین ہے کہ افسانوی ادب کی
تاریخ میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیں۔

فضل جاوید

فضل جاوید نے اگرچہ بہت کم لکھا لیکن
اتنا ضرور لکھا ہے کہ ہم انہیں بحیثیت

افسانہ نگار فراموش نہیں کر سکتے۔ ان کے افسانوں میں طنز و مزاح کا لطیف
عنصر پایا جاتا ہے جو انہیں احمد جمال پاشا سے قریب کر دیتا ہے۔ جذبات کا
ہیجان متوازن صورت میں ان کی تخلیقات کا جز بنتا ہے۔ تمل ناڈو کے دوسرے
افسانوی مجموعے ”روشنی کے بھنور“ میں فضل جاوید کی تخلیقات بھی جگہ پا چکی ہیں
اور ان کی تخلیقی صلاحیت کو تامل ناڈو کے منجھے ہوئے فن کاروں نے بھی سراہا ہے۔
حسن فیاض اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں
جس پر ہر اعتبار سے جدیدیت کا اطلاق
ہوتا ہے۔ ابتدا ہی سے ان کا رجحان جدیدیت کی طرف رہا ہے۔ انہوں نے نظموں

اور افسانوں میں علام کو خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تخلیقات کو معمہ نہیں بنایا۔ ابلاغ کے سلسلہ میں ان کی کوششیں ہمیشہ راست باز رہی ہیں۔ ان کی تخلیقات کے کردار ہمارے ہی اپنے سماج کے چلتے پھرتے، سانس لیتے، مہکتے، مسکراتے اور سکے ہوئے انسان ہیں۔ ان کے افسانوں میں ساٹھ پن کے عنصر نے کبھی جگہ نہیں پائی جس فیاض کی تخلیقات کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے زندگی اور سماجی مسائل کو جس طرح سنجیدگی کے ساتھ سوچا اسی طرح انہیں فن پارے کا روپ بخشا۔

موصوف نے اپنا افسانوی مجموعہ ترتیب دے دیا ہے۔ اگر یہ مجموعہ منظر عام پر آئے گا تو یقیناً ان کی فکری جلوہ گری، فن کارانہ بلند پروازی اور آج کے عصری تقاضوں اور نئی آگہی کا اُمیدوار ثابت ہوگا۔

صلاح الدین برقی کی شخصیت ست رنگ

صلاح الدین برقی |

دھنک کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں ہمیشہ

یہ محسوس کرتا ہوں کہ انھیں شاعر ہونا چاہیے تھا یا ہیرو — لیکن انہوں نے اپنے وجود کے اندر چھپے ہوئے ہیرو کو مختلف رنگ و آہنگ اور مختلف روپ میں اپنی تخلیقات کے اسٹیج پر لا کھڑا کیا ہے۔ ان کی طبیعت کی برقی رو تخلیق کی آگ میں تپ کر سنجیدگی کی فضا میں سانس لینے لگی ہے۔ انہوں نے اب تک اردو ادب کو جو کچھ دیا ہے ادب کا مورخ اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ خلیل جبران سے صلاح الدین برقی کی دلی وابستگی اور فکری ہم آہنگی کا زندہ ثبوت ہے۔ خلیل جبران کی تخلیقات نے ہمیشہ اُن کے احساس کے دروازے پر دستک دی ہے۔ ان کے یہاں حقائق کے ماحول میں جو ماورائی کیفیت ملتی ہے وہ انسان کو تجاہدِ ہستی کی گرہ کشائی پر مجبور کر دیتی ہے۔ صلاح الدین برقی کی جبران سے وابستگی ان کے

زاویہ نظر کو واضح کرتی ہے۔ ان میں ابھرنے کے اچھے امکانات ہیں۔ امید ہے کہ زندگی کے کسی موڑ پر بھی وہ ان امکانات کی لچک کو کم کرنے کی بھولے سے بھی کوشش نہیں کریں گے۔

سبیل عرفان کے افسانے ایک ایسی

سبیل عرفان

سچائی اور حقیقت کے غماز ہیں جسے

کوئی بھی قاری جھٹلا نہیں سکتا۔ آپ کے کچھ افسانوں سے بڑی یاسیت ٹپکتی ہوئی نظر آتی ہے اور یہی ان کو اور ان کے افسانوی فن کو بہت اونچا بھی اٹھاتی ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں دس بارہ افسانے لکھے ہوں گے لیکن انہوں نے جو کچھ لکھا اس میں احساسات کی تھر تھراہٹ، جذبات کی لو اور خلوص و محبت کی صنائی ملتی ہے۔

اعجاز شاکری کو ہلکے پھلکے کرداروں کو ٹمے

اعجاز شاکری

اچھے اور تکیے انداز میں پیش کرنے کا حکم

حاصل ہے۔ آپ کے افسانوں میں آج کی روزمرہ اور سماجی زندگی میں سانس لینے والی اچھائیوں اور برائیوں کی بہت ساری جھلکیاں نمایاں طور پر ملتی ہیں تاہل ناڈو کے افسانوی ادب میں آپ کے افسانے واقعی قابلِ توجہ ہیں۔

یعقوب اسلم کے افسانوں کی زبان

یعقوب اسلم

نہایت صاف، شیریں، شگفتہ اور رواں

دواں ہے۔ آپ کی عبارت میں کہیں جھول نظر آتا ہے نہ کہیں اظہارِ عینیت چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑے پتے کی باتیں نہایت آسانی کے ساتھ کہ جاتے ہیں۔ ان کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد قاری کو الفاظ کی بھول بھلیوں اور علامت کی تاریک اور نا آشنا گلیوں میں بھٹکنے کی ضرورت نہیں پیش آتی۔ آپ کا

افسانوی مجموعہ ”چہروں کی دیوار“ مطبوعہ 1986ء فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی
لکھنؤ کی مالی اعانت سے منظرِ عام پر آچکا ہے۔

کاف نالطی | آپ تامل ناڈو کے نقاد، شاعر
اور افسانہ نگار ہیں۔ آپ کے اکثر

افسانوں کے پلاٹ نئے نئے سے ہیں اور پیش کرنے کے انداز میں تیکھا پن اور
چونکا دینے والے نقوش ملتے ہیں۔ وہ آج کے افسانوی ادب کا خاصہ ہیں۔
آپ نے شاعری کی طرح افسانوں کو بھی یکسوئی اور اپنائیت کے ساتھ سمجھنے
اور برتنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ہمیشہ تساہل سے کام لیا ہے۔ ورنہ آپ
کی شخصیت اور فن آفاق گیر شہرتوں کا منہج ہوتا۔

عجاز | آپ کے افسانوں میں بہترین منظر کشی
کے ساتھ ساتھ نظم کا آہنگ صاف

جھلکتا ہے۔ شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی آپ نے افسانہ کو شاعری کی سی زبان
عطا کی ہے۔ کہیں کہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ آپ نثر میں شاعری کا درس
نچوڑ رہے ہیں۔ آپ کے افسانوں کی یہ خصوصیت تامل ناڈو کے اکثر
اجباب کے ذہنوں میں جلوہ فگن ہے۔

محمد فیاض حسین | محمد فیاض حسین بمقام مدراس 1943ء
میں پیدا ہوئے۔ 1960ء سے 1968ء

تک فیاض یہاں کے ادبی محفلوں اور شعری نشستوں کی کارروائی میں ہمارے

لے آپ کا ایک تنقیدی مجموعہ ”ہجرتِ راش“ 1985ء میں شائع ہو چکا جس میں علیم صبا نویری
کی شاعری کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

درآز امتیاز، کاوش بدری، ادیب بھارتی، انور ربانی، حسن فیاض، علیم صبا تویدی، تقار ضوی، صلاح الدین برق اور فضل جاوید) ہمسفر رہے۔ انہوں نے شاعری سے زیادہ نشر کی طرف توجہ دی۔ بالخصوص افسانوی ادب میں ان کی شناخت آج بھی محفوظ ہے۔ زندگی کے روزمرہ مسائل اور ان مسائل سے جنم لینے والی اچھائیوں اور برائیوں کو اپنے مختصر ترین افسانوں میں بڑے اچھے اور تیکھے انداز میں منعکس کرنے کے فن سے فیاض بخوبی واقف ہیں۔ اگرچہ انہوں نے بہت کم افسانے لکھے ہیں۔ لیکن جتنے بھی لکھے ہیں۔ وہ تامل ناڈو کے اردو افسانوی ادب میں ناقابل فراموش ہیں۔

فیاض نے وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کے بعد اردو ادب سے مستقل طور پر کنارہ کشی اختیار کر لی۔ میں یہی کہوں گا کہ اگر فیاض حسین، صلاح الدین برق اور فضل جاوید جیسے جُنس فن کار دوبارہ ادب کی طرف رجوع کریں تو یقیناً ان کے تخلیقی جواہر پارے تامل ناڈو کے اردو ادب میں اضافہ ثابت ہوں گے۔

انور کمال

انور کمال کے افسانے آج کے دور کے حالات، احساسات اور جذبات کی

بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ ان میں ایک اچھا افسانہ نگار بننے کی تمام تر خوبیاں موجود ہیں۔ بشرطیکہ خاص لگن اور مسلسل انہماک کے ساتھ پورے لور و فلام کرتے رہیں۔

غیاث اقبال کا ہر افسانہ پلاٹ کے اعتبار سے بالکل نیا ہونے کے علاوہ

آج کی آگہی سے بہت زیادہ میل کھاتا ہے۔ ان کے یہاں کرداروں کے پیش

غیاث اقبال

کرنے کا ڈھنگ بھی بڑا چونکا دینے والا ہوتا ہے۔ انہوں نے افسانے کو نئے زاویے دینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

صبّا مصدّہ

محترمہ صبّا مصطفیٰ کا ذہنی رشتہ
تامل ناڈو سے بہت گہرا ہے۔ اس لیے

کہ ان کی علمی اور ادبی تربیت میں اس سر زمین کی مٹی کی سوندھی خوش بو کا بہت زیادہ دخل ہے۔ باوجود یہ کہ ان کا خمیر ہندوستان کے سدا بہار خوشگوار اور خوب صورت جزیرے ”انڈمان“ سے بنا ہے تاہم ان کی ذہنی پرورش و پرداخت تامل ناڈو کے جید اور مستند شعراء کے درمیان میں ہوئی۔

محترمہ صبّا مصطفیٰ کے افسانے جدید دور کے عکاس نہ سہی لیکن ان میں برائیوں، گندگیوں اور رسوبوں میں رنگتے ہوئے جراثیم سے مقابلہ کرنے بلکہ اپنے طور پر انھیں ہلاک کرنے کی بڑی حد تک صلاحیت موجود ہے۔

شبیب احمد کاف

شبیب کی علمی ادبی تربیت
وانمباڑی کے دینی اور مذہبی ماحول میں ہوئی

یہی وجہ ہے کہ ان کے اکثر افسانے ”اسلامی نظریات“ کے دائرے کے چکر لگاتے ہیں انسانی نفسیات کی دھوپ چھاؤں اور احساس کے تاروں کو چھیڑتی ہوئی کیفیات سے ان کے افسانوں کا خمیر تیار ہوتا ہے جو زندگی کے نشیب و فراز سے انھیں بہت زیادہ قریب کر دیتا ہے۔

اے المتوفیٰ ۱۹۹۲ء (موصوف سے اردو ادب کو بہت زیادہ امیدیں وابستہ تھیں لیکن وقت پہلے موصوف کا اچانک ہمارے درمیان سے اٹھ جانا ایک ناقابل فراموش سانحہ ہی نہیں بلکہ اچانک علمی ادبی چشمے کا خشک ہو جانا بھی ہے۔

اکبر زاہد

اکبر زاہد کی ذہنی تربیت میں بھی لمباٹری
کے ادبی ماحول کا بہت زیادہ دخل ہے

ان کے افسانے جدید عصری رجحانات کے حامل ہیں۔ ان کے ہاں عرفانِ ذات کے
دریا میں غوطہ لگا کر موتی ڈھونڈ نکالنے کا عمل بہت روشن ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا
ہے کہ وہ ایک دن ضرور اس عمل میں کامیاب ہو جائیں گے۔

مندرجہ بالا جدید دور کے افسانہ نگاروں کے علاوہ تامل ناڈو کے
افسانوی ادب میں حبیب خان سروش داؤدی، عزیزہ تمنائی، دانش فرازی
راجی صدیقی، عبد المتین ہوش، رشید احمد فاروقی، مصباح اللہ، ساحل رشید
اور آئندہ ہو کر (فرحت کیفی) کی تخلیقات بھی ”سفینہ“، ”فانوس خیال“،
”معیارِ ادب“، ”مصحف“، ”زندگی“، ”پاکیزہ“، ”مشعل“، ”فلم دلش“،
”ساون“، ”ادبی رپورٹ“، ”اتحاد“ ہفت روزہ، پندرہ روزہ، ماہوار جریدوں
میں جلوہ افروز ہیں۔

مذکورہ بالا افسانہ نگاروں نے افسانہ نگاری کو تفریحی مشغلہ تصور
کرتے ہوئے ہلکے پھلکے افسانے جو سطحی جذبیوں سے مزین تھے، لکھے جن سے
افسانوی فن کو فروغ ملانہ زندگی لیکن دانش فرازی، ساحل رشید، آئندہ ہو کر
(فرحت کیفی) کے افسانوں میں انشائیہ پن بہت زیادہ نمایاں تھا اور کہیں
کہیں ان افسانہ نگاروں کی تخلیقات ہیں عصری آگہی کے واضح خدوخال
بھی اجاگر ہوئے ہیں۔ تعجب اس بات کا ہے کہ شمال کے فکشن کے نقادوں
کے علاوہ خود مددِ اس کے اربابِ علم و فن نے یہاں کے بہترین افسانہ نگاروں
کو اپنی تحریروں میں قابلِ اعتناء نہ سمجھتے ہوئے کو فرہنی سے کام لیا ہے۔
افسانوی میدان سے ہٹ کر تامل ناڈو کے معدودے چند

فن کاروں نے ناول کی طرف توجہ دی۔ جن میں مولانا فیضی صدیقی، رشید مدرسی، راز امتیاز، کے آر جبینی، علی اکبر امبوری، امیر الضیاء، صبا مصطفیٰ، علیم صبا نویدی کے نام قابل ذکر ہیں۔

رشید مدرسی نے تین چار ناول لکھے۔ ان میں سے ایک ناول ”مہر“ مشورہ بکڈ پوڈہلی سے شائع ہوا۔ کے آر جبینی کا ناول ”ننگا ماحول“ حیدرآباد سے اور امیر الضیاء کا ناول ”عبرین“ مدراس سے طبع ہوا۔ مولانا فیضی صدیقی کے جاسوسی ناول (جن کا ذکر ان کے باب میں آئے گا) آج بھی اشاعت کے مرحلے میں منت ہیں۔ راقم الحروف کا ناول ”ادھورا پیار“ جس میں آج کی فکری اور فنی اڑانوں کا جائزہ لیا گیا ہے اپنی تازگی کے احساس کے ساتھ نئی لائبریری کی زینت بنا ہوا ہے۔ راز امتیاز کا ناول جو آدھے سے زیادہ مکمل ہو کر اپنے آخری موڑ کے انتظار میں ہے۔ اور صبا مصطفیٰ کے دو ناول ان کی الماری میں پڑے اشاعت کے انتظار میں ہیں۔

من حیث المجموع تامل ناڈو کے فنکار کسی اعتبار سے بھی اردو علم و ادب کی دنیا میں کبھی پیچھے نہیں رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ شہرت کے افق کو چھو نہیں پائے اور انھیں وہ وسائل اور سہولتیں بھی میسر نہیں کہ وہ اپنے آپ کو اونچا اٹھا کر اپنی خدا داد صلاحیتوں کو دنیائے ادب سے آشنا کر سکیں۔ ●●

بشکریہ ”ٹمل ناڈو میں اردو“
ترقی اردو بیورو۔ نئی دہلی



تامل زبان کے جدید افسانہ نگار

دنیا کے قدیم زبانوں میں تامل (Tamil) بھی ایک قدیم زبان مانی جاتی ہے۔ ہزاروں سال کی عمر رکھنے والی یہ زبان اور اس کا ادب بھی بہت پرانا اور کئی خصوصیتوں کا حامل ہے۔ جدید، جدید تر کے علاوہ قدیم کلاسیکی ادب کے بھی کئی ادوار بتائے جاتے ہیں۔ جن میں سے تین ادوار کا کافی مواد پایا جاتا ہے۔ ان ادوار کی تاریخوں اور زمانوں کا تعین ابھی تک محققین السنہ سے نہیں ہو سکا ہے۔ ان تین قدیم ادوار کی نشوونما میں مختلف انجمنوں اور مجلسوں نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ جو اس عہد کے دانشوروں اور اہل قلم حضرات پر مشتمل رہی ہیں۔ انھیں مجلسوں میں اس دور کی نئی نئی تصنیفات وغیرہ پیش کی جاتیں اور ان پر تنقید و تبصرہ اور جرح و قدح ہوتی اور اس طرح اس ادب کو ترقی کی سمت لے جانے کی بھرپور کاوشیں ہوتی رہیں۔ لہذا ان ادوار کو مجلسی ادوار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بعد میں چل کر آہستہ آہستہ تامل زبان نے اپنی وسعت و گیرائی سے مختلف علاقوں

میں اپنے قدم جانے شروع کر دیئے اور دو ایک مرکز سے ہٹ کر اس کے کئی ایک مرکز قائم ہو گئے۔ اہل زبان کے نقطہ نظر کے مطابق اس کو تین حصوں میں یعنی اس کے ادبی اقدار کو تین صنفوں میں سمودیا گیا۔

1۔ اِنیل (E.L) (نثری ادب) جو اس کے کلاسیکی دور کے اواخر تک بہت ہی قلیل اور نہ ہونے کے برابر رہا ہے۔

2۔ ای سئے (Easai) (موسیقی) منظوم ادب (جو اس کی بنیادی صنف بھی ہے)

3۔ نالک دفون لطیفہ تیسری صنف جو نالک کہلاتی ہے اس

صنف کی عظیم کاوش سیلپی گارم (Sillappadhi Garam) ہے جس کو پڑھنے کے بعد یہ حیرت انگیز بات سامنے آتی ہے کہ ہزار سال پہلے کی یہ تحریر آج کے جدید تر ادب کے بالکل مماثل ہے۔ اسی طرح پُرانا نور (Poor Na noor)

اور (Agghay Nanoor) نامی نال ادب کی پرانی کتابوں میں سینکڑوں مختصر افسانے لکھے ہوئے ملیں گے۔ جس دور میں راجہ مہاراجہ حکومت کر رہے تھے اور ان کے سوا کسی اور کی بات نہیں چلتی تھی اس وقت بھی اس کے ادب میں عوام ہی کی عکاسی کی جاتی رہی۔ مثلاً بہادری، عشق و محبت، غم و الم اور اپنے معاشرے کے مسائل پر مشتمل افسانے لکھے جاتے رہے ہیں اور ان میں سے تقریباً پورے کا پورا ادب منظوم ہی نظر آتا ہے۔ اور نثری ادب کا دور دور تک کہیں پتہ نہیں چلتا۔

آج کے دور میں لکھے جانے والے افسانے کی ارتقائی شکل کو اگر غور سے دیکھا جائے تو اس نوع کی صنف کے وجود کا پتہ اس زبان میں ستراسی سال پیشتر چلتا ہے دوسری زبانوں کی طرح مغرب نے بھی اس کے

ادب کو کافی متاثر کیا ہے اور مغرب زدہ اہل قلم نے پوری پوری تقلید میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ باایں ہمہ تامل ادب کی خصوصی چھاپ برقرار ہے اور وہ تامل کلچر اور اس کی ماحولی ہئیت کا عکاس ہے اور پورے ارتقا کے باوجود کلاسیکل انداز کی جھلکیاں واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہیں۔

مختصر افسانہ نگاری کے فردغ کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس میں فرصت کی کمی خارج نہیں ہوتی، اس کے بالمقابل ناول طویل وقت کے متقاضی ہوتے ہیں۔ تامل افسانہ نگاری کو فردغ دینے میں اور ارتقائی منزلوں تک پہنچانے میں تامل کے موثر ماہناموں منی کوڈی (Mani Kodi) (جو اہرات والا جھڈا) ندائی (Nadai) اچلن کساڈاپترئی (Kasada patrai) نیان رتھم

(Nana Ratham) نے بہت اہم رول ادا کئے تھے۔ ان ماہناموں کے ذریعہ اس صنف کی بڑی آبپاری ہوئی اور وہ دنیا کی دوسری زبانوں کی اس صنف کے برابر درجے والی صنف شمار کی گئی۔ مختصر افسانہ نگاری کے مقابل ناول کا سرمایہ بالکل کم اور دوسری زبانوں کے مقابلے میں کسی بھی اہمیت کا حامل نظر نہیں آتا۔ اکثر و بیشتر ناول نگار آج افسانہ نگاری کی طرف ہی لوٹ آئے ہیں اس لحاظ سے افسانہ نگاروں کی ایک بہت بڑی پیدائش موجود ہے۔ جن کا اجمالی جائزہ بھی اس مضمون میں مشکل ہے۔ تامل زبان کے چند ایک چوٹی کے افسانہ نگاروں کا تذکرہ فی الحال اجمالی ہی پیش کرنے کی یہاں گنجائش ہے۔

ذیل میں تامل کے چند مشہور افسانہ نگاروں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

پدومے پٹن (Pudumaipittan) اس قلمی نام سے مشہور اور مختصر افسانہ لکھنے والے فنکار نے پہلے پہل ایک اور نام سے لکھنا شروع کیا تھا اور اسے اس وقت کوئی قبولیت

نہیں ملی تو اس نے آگے چل کر اپنا قلمی نام بدل دیا اور پُر و مئے پتلی کے نام سے آج وہ مختصر افسانوں کا بڑا ماہر فن کار تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے افسانے آج کے بے حد پسندیدہ اور معیاری افسانے تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اس نے تامل زبان کو سنسکرت زبان کے بوجھل اور مشکل الفاظ سے پاک کرنے کے علاوہ سادہ سلیس اسلوب بخشا ہے جس سے خواص کے ساتھ عوام بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور اس کے افسانوں کی قدر و قیمت، مقبولیت اور مانگ آج بھی اتنی ہی ہے جتنی کل تھی۔

ابتدائی زمانے میں دنیا

بھر کی بہت ساری تکلیفیں

JAI KANTHAN)

کانتھن

اور اذیتیں اٹھانے والی یہ شخصیت کمونزم (Communism) کی طرف بے حد مائل تھی۔ اگنی پرولیسیم (Agni poruvasam) نامی اس کا ایک

افسانہ تامل کے موثر جریدہ آنندا وکٹرن (Ananda Vikdan) میں شائع ہوا تھا۔ یہی افسانہ اس کی فوری مقبولیت کا ضامن بنا۔ اس افسانہ میں ایک

برہمن دوشیزہ کو ایک مال دار نوجوان لفٹ دینے کے بہانے بھگالے جاتا ہے اور اس کی آبرو لوٹ لیتا ہے۔ اس دوشیزہ کی ماں اس جان لیوا واقعہ سے بے حد متاثر ہوتی ہے اس کی بے بضاعتی اور مجسم بھلاہٹ کے گرد

گھومتا ہوا یہ افسانہ فن کی انتہائی بلندیوں کو چھوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اور اس کی مانگ زمین بہ زمین، منزل بہ منزل اتنی بڑھتی ہے کہ آخر کار اس افسانے کے تخلیق کار کو اسی واقعہ کو وسعت اور کشادگی دے کر ایک ناول کا روپ دینے کا موقع میسر آتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ اسی کہانی کو پردہ قلم پر منتقل کئے جانے کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس ایک افسانہ پر

ظن و تنقید کرتے ہوئے کئی ایک قلم کاروں نے مختلف افسانے بھی لکھے لیکن اس افسانہ کی مقبولیت میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ اسی افسانہ نگار نے ایک اور افسانہ ”ور پڑی سور“ (Our padi sore) (ایک سیر کھانا) میں جھوٹے پیٹیوں اور انتہائی تنگ و تاریک ماحول میں بسنے والے مجبور انسانوں کی مفلوک الحالی کی منظر کشی کی ہے اور اس گندے، گرے ہوئے ماحول کے پروردہ لوگوں کی خاص زبان اور لہجے کو اس طرح منتقل کیا ہے کہ اس زبان کا بھی ادب میں ایک خاص مقام متعین ہو جاتا ہے۔ اس فن کار سے پیشتر کسی اور فن کار نے اس طرح کی کوشش نہیں کی تھی۔ اسی افسانہ نگار کا ایک اور افسانہ ”وہ کس کے لیے رویا“ بہت سوز و گداز کا حامل ہے اور تامل ادب میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس فن کے کئی ایک افسانوں میں افسانہ ”پیارس کو پو“ (Parry's ku po) ”پیارس کو چل“ آج کے جدید انداز اور نقطہ نظر کا آئینہ دار ہے۔ اس افسانے میں ایک مصوّر اور اس کے فنِ مصوّر پر بڑے اچھوتے انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سے بہت کر اس افسانہ نگار کے بہت سے افسانے انقلابی خیالات اور مساوات و برابری کے نظریات کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ اور اس کے یہ تمام تر افسانے فنی اعتبار سے اور مقبولیت عامہ کی سندر رکھتے ہیں اور تامل افسانہ نگاری کی تاریخی بارگاہوں میں اپنا انمٹ نقش ثابت کر چکے ہیں۔

تامل کے بہترین افسانہ نگاروں میں ایک ہے۔ جس کے قلم کی شگفتہ کاری،

سندر رما سوامی

عجیب کیف و تاثر کی حامل ہوتی ہے۔ اس افسانہ نگار کا ایک افسانہ

”املی کے درخت کی سرگزشت“ حیرت (Pullai Marathu Kadai)

انگیز اور شرافت پر ہے۔ مختلف النوع حالات اور واقعات کو املی کے درخت کی زبانی اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا خود کو ایک املی کا درخت محسوس کرنے لگتا ہے ایک جامد اور ساکت مخلوق کے آگے کئی متحرک مخلوقات، کئی ادوار کا گزر ہوتا ہے اور یہ چلتی پھرتی تصویریں کے روپ میں پیش ہوتے ہیں جس سے ذہن و فکر کافی متاثر ہوتے ہیں۔ آخر کار کہانی کا انجام حد درجہ رقت انگیز ہو جاتا ہے۔ جب کہ کئی ایک واقعات و مشاہدات کے شاہد و گواہ اور زمانے کے سرد و گرم سے آشنا، اس درخت کو کاٹ کر پھینک دینے کا درد انگیز منظر اس انداز سے سامنے آ جا کر کرتا ہے کہ بے اختیار قاری کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں اور قلم کار کا قلم جادو جگتا نظر آتا ہے۔

دنیا سے اٹھ جانے والے اس فن کار

دیون (DEWAN)

کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے افسانوں

کی دنیا میں بڑی سرعت اور قلیل عرصہ میں اپنا ایک خاص مقام اپنی منفرد طرز نگارش کی وجہ سے بنالیا ہے۔ اس افسانہ نگار کی تخلیقات میں طنز و مزاح کے علاوہ تجربہ و تجسس اور سنسنی خیز ماحول اور واقعات کی نت نئی پھلجھڑیاں افسانوی فضاؤں میں جھوٹتی ہوئی دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اس کے افسانوں کا ایک عالم گرویدہ ہے۔ آج بھی اس کی تحریریں تامل افسانوی ادب میں اپنی ساکھ قائم رکھے ہوئے ہے۔

آر۔ کرشنا مورتی نام سے منسوب اس

کلکی (KALKI)

فن کار کا قلمی نام ”کل کی“ ہے۔ اس نے

بھی تامل ادب اور افسانہ نگاری کو جدت اور نئی آگہی بخشی اور طرز افسانہ نویسی

کو ایک نیا موڑ دیا ہے۔ تاریخی اور معاشی ماحول کی تصویر کشی میں اسے یدِ طولیٰ حاصل تھا۔

تامل افسانہ ”پلاک ٹو کی گھل“

(Pallakku Thuki Ghal)

نیل ایس رامامترم

(Gottu Melum) ”پالکی اٹھانے والے“ کہاروں سے متعلق ”گوٹو ملیم“

”نفس انسانی اور خواب“ جیسے عنوانات پر انتہائی پیچیدہ قسم کے مسائل کو بڑے سلیجھے ہوئے انداز میں پیش کرنے کا خاص سلیقہ رکھتا ہے۔ مذکورہ افسانے تامل زبان کے شاہکار افسانوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

اشوکا مترن (ASHOKA MITHRAN)

اس افسانہ نگار کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس نے شہریوں کا پوسٹ مارٹم کرنے کے علاوہ دیہاتوں کی مجبور زندگی اور ان کی بد حالی کی ”پریم چند“ کی طرح بڑی اچھی متاثر کن عکاسی کی ہے۔

اس افسانہ نگار کے آئندہ افسانے یقیناً تامل افسانوی ادب میں اضافے کا باعث بنیں گے۔

اس نام سے لکھنے والی نہیں بلکہ لکھنے والے افسانہ نگار کی فکری کاوشیں بھی

(SUJATA)

سُجاتا

عوام میں خاصی مقبول ہیں۔ اس تخلیق کار کے طرزِ تحریر کا نوجوان طبقہ بڑا دلدادہ اور گرویدہ ہے۔ اور اس کی تقلید کو ایک فن سمجھتا ہے۔

یہ افسانہ نگار بھی مختصر اور جدید افسانوں کے میدان میں کافی مشہور اور معروف ہے۔

(T. JANKIRAMAN)

ٹی۔ جانکی رامن

اور اس کے کئی ایک ناول بھی منصفہ شہرہ پرآ کر شہرت کی بلندیوں کو چھو چکے ہیں۔

یہ چاروں خواتین

افسانہ نگار آج

کی ابھرتی ہوئی

فن کارہ ہیں۔ ان

کے افسانے آگے

چل کر اردو ادب

شیشنکری (SIVA SANKARI)

اندومتی (INDUMATHI)

لکشمی اور (LAKSHMI)

انورادھا منن (ANURADHA MENON)

چل کر

کے عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور اور صالحہ

عابد حسین کے رنگ کے حامل ہو سکیں گے۔ آج بھی ان خواتین کے افسانے بڑے

ذوق و شوق سے عوام میں پڑھے جاتے ہیں۔

بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ

نشر ۱۹۵۵ء



غالب کا ایک مجموعہ..... لطیفہ آرکائی.....

قاملے نادور کی تین سو سالہ تاریخ ادبِ اردو کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ آج سے تین سو سال پہلے ہی اردو غزل نے اس سرزمین پر ایک فضا تیار کر لی تھی اور خصوصیت سے نوابانِ آرکائی میں نواب غلام غوث خان اعظم کے دور میں اس کو بھر پور ترقی، سرفرازی و سر بلندی عطا ہوئی۔ نواب غلام غوث خان اعظم کے دور کو ہم اردو غزل کا زریں اور سنہرا دور کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

نواب غلام غوث خان بہادر اعظم نہ صرف بڑے ہی ادب نواز، نکتہ شناس، دیدہ ورتھے بلکہ خود بھی ایک ادیب اور شاعر تھے۔ انہوں نے اپنے دورہ (1820ء تا 1855ء) میں ایک ایسے مشاعرے کی بنیاد ڈالی تھی جس کے میرِ مجلس افضل الشعراء مولوی محمد حسین خان راقم جو بقول جہدی واصف (مؤلف حقیقۃ المرام 1278ء) لے

لے مترجم "حقیقۃ المرام" سخاوت مرزا (مطبوعہ انجمن ترقی اردو، پاکستان۔

گلزارِ اعظم کے مؤلف بھی تھے۔ اس مشاعرے کی مثال سارے ہندوستان میں تو کیا بلکہ ایران میں بھی نہیں ملتی۔ مشاعرے کی نوعیت ایسی تھی کہ ہر شاعر کے کلام پر برسرِ محفل باقاعدہ تنقید ہوتی تھی۔ الفاظ کی تحقیق، زبان اور اسلوب سے متعلق مناسب مدلل اور موثر تاثرات کا اظہار ہوتا تھا۔ نواب غوث خان اعظم بہ نفس نفیس خود ان مشاعروں کی صدارت کرتے تھے۔ تنقید کے سلسلہ میں ان کا فیصلہ اٹل سمجھا جاتا تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ تنقید اور جوابِ تنقید، پھر فیصلہ، یہ سب کچھ نہایت خوش گو اور سازگار ماحول میں ہوتا تھا۔ اور کوئی کشیدگی یا رنجش کی بات پیدا نہیں ہوتی تھی۔ نواب غوث خان اعظم کے دربار سے سُرخ رُو اور فیض یاب ہونے والے شعراء کی فہرست کا صحیح اندازہ ہمیں "تذکرہ گلزارِ اعظم" کے مطالعے سے ہوتا ہے۔ اس تذکرے سے ہٹ کر غلام غوث خان اعظم کے آخری دور میں سید سیف الدین لطیف آر کاٹی جیسا خود دار، منکسر المزاج اور اپنے وقت کا جید شاعر بھی اپنی تنگ دستی کی وجہ سے ان کی مدح سرائی کرتے ہوئے مالی امداد حاصل کرتا ہے۔

۵

یا غوث رکھ سلامت نواب غوث خان کو
کیوں نہ اس کے مدح عالی میں کورنِ فکر سخن
یہ مختصر قصیدہ بولا لطیف گر چہ

لاکھوں کی پرورش کو یہ یک لبر لبس ہے
قدر کچھ اہل سخن کی ہے تو اس کے پاس ہے
مقبول غوث ہوں تو یہ دل پذیر لبس ہے

۱۔ غوثِ الاعظم دستگیر

۲۔ "کے" لطیف کے ہاں بعض "نونت" الفاظ "تذکرہ" میں استعمال ہوئے ہیں۔ اس طرح کے اغلاط اُس دور کے شعراء کے کلام میں موجود ہیں۔ مخطوطات میں کی کو کے بھی لکھا جاتا ہے۔

۳۔ نواب غلام غوث خان اعظم

ٹلن ناڈو کو ادبی تاریخ شاہد ہے کہ دربارِ نوابانِ آرکاٹ میں ہمیشہ شعراء اور ادباء اور مجید علماء کا جگمگا لگتا رہتا تھا۔ نوابانِ آرکاٹ کی وسیع النظری اور فراخ دلی ہندوستان کے ہر گوشہ میں مشہور تھی۔ عادل شاہی سلطنت کی تباہی کے بعد دور دراز مقامات سے بہت سے شعراء اور علماء آرکاٹ اور ویلور آئے اور ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ لیکن آج تک یہ بات مستند طور پر پایہ ثبوت کو نہیں پہنچ سکی کہ لطیف آرکاٹی نے اپنے وطن شرزہ پور (میسور) کو کیوں اور کب خیرباد کہا اور آرکاٹ کو کیوں اپنا مسکن بنایا۔ مؤلف ”بقائے دوام“ سید احمد

ایڈوکیٹ (بنگلور) لطیف آرکاٹی کا تعارفی خاکہ پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ: ”حافظ محمد خان جوہ (جو شرزہ پور کے جاگیردار اور نواب مر لطیف آرکاٹی

کے مرثی اور محسن بھی تھے) کے انتقال 206ھ 1290ء کے بعد لطیف نے اپنا وطن ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر آرکاٹ کا رخ کیا۔ لیکن لطیف کے یہ اشعار دیکھیے:۔

اسم اس فیاض عالم کا یہی معروف تھا حضرت حافظ محمد خان جوہ، مشہور ہے
 یک ہزار و دو صد شش سال کی پیری وہ راہی جنت ہوا، سجدے میں سو مذکور ہے
 جازارت کو تو اس فیاض عالم کی لطیف مرتد عالی پر جس کے حق کا دائم نور ہے

دوسرے شعر سے لطیف کے محسن حافظ محمد خان جوہ کی تاریخ وفات کا اندازہ ہوتا ہے مگر تیسرے شعر کی روشنی میں یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے حافظ محمد خان جوہ کی وفات سے پہلے ہی لطیف نے شرزہ پور چھوڑ دیا تھا۔

احمد اللہ خان مرحوم (مدثر جمہور“ بنگلور) نے ماہنامہ ”محزن“ میں اپنے مضمون میں ”میسور کا ایک نام ور شاعر“ لطیف آرکاٹی“ میں لطیف کی تاریخ

پیدائش اندازاً ۱۱۷۸ھ ۱۷۶۴ء اور تاریخ وفات ۱۲۸۹ھ ۱۸۷۶ء بتائی ہے۔

انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ لطیف کی وفات کی تصدیق مدراس کے مشہور و معروف شاعر مولانا عبدالرحمن خان بہادر شاطر مدراسی (اشیمہ ارکاٹی کے پوتے) اور ان کے برادر محمد منور حسین خان بہادر گوہر مدراسی (مولف سخنورانِ بلند فکر: مطبوعہ ۱۹۳۷ء) سے کی ہے۔

مولانا ابوالجلال ندوی مرحوم (وفات ۱۹۸۴ء بمقام پاکستان) نے لطیف کی تاریخ پیدائش اندازاً ۱۲۷۵ء قرار دی ہے۔ اور یہ بھی اقرار کیا ہے کہ لطیف ۱۲۹۵ء سے بہت پہلے آرکاٹ آچکے تھے۔ لیکن تاحال تلاش و تحقیق کے باوجود

لطیف کی صحیح تاریخ پیدائش کا پتہ نہیں چلتا۔ لطیف کے کلام کی اندرونی شہادتوں سے اس کے وطن چھوڑ دینے کا پس منظر یوں اُجاگر ہوتا ہے۔

کب تک پڑا رہے گا تو اپنے وطن کے بیچ عزت نہیں ہے گل کو مقامِ چین کے بیچ
ایک تصویر وطن چھوڑنے کی یوں بھی کھینچی ہے:

مانندِ گل چین سے جب تک نہ ہو جدا اہلِ ہنر کی قدر نہیں ہے وطن کے بیچ
گویا لطیف کے فن کی قدر دانی خود اپنے وطن میں نہیں ہوئی تو اس نے دل برداشتہ ہو کر شہرہ پور سے ترکِ وطن کر کے آرکاٹ میں مستقل سکونت اختیار کی۔

لطیف کے شہرہ پور چھوڑنے کا ایک اور سبب اپنے بڑے بھائی سے نا اتفاقی ہے جو خود اس کے اپنے کلام سے واضح ہے۔ اس ناچاقی کے برسوں بعد جب ایہ کے کچھ بھتیجے اس سے ملنے آرکاٹ آئے تو لطیف نے ترکِ وطن کا ذکر ان سے یوں کیا ہے۔

اے رفیقو تمہارے خاطر تڑپ رہا ہے چچا تمہارا

ذرا تو پوچھو بدر سے اپنے کہاں ہے بابا چچا تمہارا

حرم میں جا کے تم اس کے خاطر ہر ایک تپیر سے اتنا بوجھو

ہمارے بابا کی سنگدلی سے ہمارا آخر چچا سدھارا

بڑے بھائی اور اپنے رشتہ داروں کی جدائی نے لطیف کے دل و دماغ کو قریب قریب مجروح کر دیا تھا۔ لطیف نے بقول احمد اللہ خان مرحوم ”سولہ سال کی عمر میں بہت صدمے اٹھائے اور زمانے کے دکھ جھیلے تھے“ راقم کا خیال ہے کہ لطیف نے اسی ذہنی خلفشار اور دلی رنجشوں سے رستکاری حاصل کرنے کے لیے بیس سال کی عمر میں ریپو سلطان کی شہادت 1213ھ سے پہلے) آرکائیو کیا اور یہیں شادی کی اور صاحبِ اولاد ہوا۔ لیکن وقت کی ستم ظریفی نے یہ سب کو یہاں بھی آرام اور سکون سے زندگی بسر کرنے نہ دیا۔

بد قسمتی سے لطیف کو نہ بیوی ہم خیال ملی اور نہ ہی فرماں بردار اولاد۔ اس خیال کی توثیق ذیل اشعار سے ہوتی ہے۔

جو ترے بندے ہیں صالح پاک باطن اے لطیف

عصمت و غیرت کے اُن کو پار سا عورات دے

(بمعنی نیک)

عورتِ نیک سے ہے مرد کو آرامِ لطیف نہ ہو ایسا تو جئے لگ ہے وہ جوڑا گھوڑا

وہ اپنی اولاد کے ناخلف اور ناہنجار ہونے کا رونا یوں روتا ہے کہ

عجب کام، قسمت کا گولہ ہوا میں پیرا تھا خرما سندولا ہوا

(بمعنی بونا)

تخمِ لیمبو جہاں بوتا ہوں تو مہوتا ہے نیم ایسے تخمِ بد کے یاں بونے سے نہ بونا بھلا

نوح کا بیٹا بھی ہو تو صاف کہہ دینا لطیف ناخلف اولاد کے ہونے سے نہ ہونا بھلا

بیوی اور اولاد کے رنج و غم نے لطیف کی شاعری کو کس طرح جلا

بخشی اس کا اندازہ درج ذیل شعر سے ہوتا ہے۔

کب سائی تھی شعر کو میرے یہ مری آہ کی رسائی ہے

بڑے بھائی، بیوی اور اولاد کے ساتھ ساتھ لایہ کو دنیا والوں
سے بھی نفرت ہو چکی تھی اور اُسے یہ احساس بھی ہو چلا تھا کہ یہ دنیا بڑی مطلب
پرست، خود غرض اور ریاکار ہے۔

عجب یہ دنیا کی بے وفائی لطیف دیکھا تو اے عزیزو

نہ شکرِ نعمت کسی میں باقی نہ کس میں قدرِ ملک ہی ہے

(یہاں کس میں کی بجائے کسی میں ہونا چاہیے)

میں نے دنیا کے کیا باتوں سے توبہ توبہ کر چکا اس کے خراباتوں سے توبہ توبہ

عجب رنگِ دنیا کا دیکھا لطیف کہ یاں زراغِ صحرا بگولہ ہوا

لطیف نے جس مذموم دور میں سانس لی تھی اُس دور کے عوام کی

تعریف اس نے بہت حسین انداز میں کی ہے۔ پتہ نہیں یہ کون لوگ ہیں۔

ہو سکتا ہے آج بھی ان کی نسل آرکاٹ کے مصافات میں موجود ہو۔

امیدِ قوم بد سے ہر گز کبھی نہ رکھیے جگ میں وفا کسی سے کرتے ہیں کب کینہ

آگے چل کر یہی اس قوم سے متعلق کہتا ہے کہ اس قوم کے

لوگ بظاہر آئینہ صفت اور آئینہ رو ہیں مگر ان لوگوں کا دل کینہ سے بھرا

ہوا ہے۔

آئینہ رو کو ہر گز دل صاف تم نہ سمجھو مانندِ تیغ کے یہ رکھتے ہیں رنگِ کینہ

منہ اوپر صاف ہے جو دل سے منافقِ لطیف ایسے کم ظرف کو تم دل میں کبھی مت جادو

پتہ نہیں کس کم ظرف نے یہی لایہ کو گالی بھی دی تھی مگر یہی سادہ

سے تھا اس نے صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے اپنے دل کو یوں سنبھالا دیا تھا:

گالی کا غم نہ کیجیے کسی حال میں لطیف اکثر جہاں میں دیتے ہیں سالے و سالیاں
اور پھر انہیں گالیوں کے تحفے کو لطیف اشاروں اور کنایوں میں ٹھہال
کر اشعار کی خوشبو میں عطا کرتا ہے : ۷

کیا سخت ہیں صبا ترے گلشن کے مالیاں بلیل کے آہ و نالے پہ دیتے ہیں گالیاں
گالی گئی ہوا پہ تو ہنس ہنس کے گل سبھی برگِ چین سے مل کے بجاتے ہیں تالیاں
گالی سے سخت تر ہے بُری بات یا ر کی! سچ ہے کہ سو سنا ر کی نو یک ہمار کی
لو ہار

لطیف بڑی عجیب صفات کا مالک تھا۔ وہ ان کم ظرفوں اور ظاہری
شرافت داروں کے درمیان رہ کر بھی اپنے شریف اور نجیب الطرفین ہونے کا
دعوئے کرتا رہا : ۷

کم تر ہوں بندگانِ الہی سے اے لطیف طرفین سے اگرچہ نسب میں شریف ہوں
اور پھر وہ ببا نگر دہل کہتا ہے : ۷

ثابت ہے احادیث سے تکریم ہماری واجب ہے مسلمانوں پر تعظیم ہماری
سادات کی ہے قدر اسی حق شناس کو جس کو خدا رسول کا ہے پاس و امتیاز
لطیف نے جہاں اپنے نیک صالح اور شریف ہونے کا دعویٰ کیا

ہے وہیں شرفاء میں جن صفات کا ہونا ضروری ہے اس کا اظہار یوں کیا ہے : ۷
صاحب وہی شریف وہی نامور وہی جگ میں کیا جو زندگی شرم و حیا کے ساتھ
لطیف کی شاید انہیں صفات نے نواب غوث خان اعظم کا

دل موہ لیا تھا۔ آخر ش نواب غوث خان اعظم کی نوازشات کا لامتناہی
سلسلہ اس قدر جاری رہا کہ لطیف نے گنج سوائی حضرت قادر ولی ناگوری
اور ہندالوی خواجہ معین الدین چشتی غریب نواز اجیری کی مقدس زیارت سے

مشرف ہونے کے بعد حج کے لیے بھی کمر باندھی..... ان مقدس مقامات پر پہنچ کر اس نے غوث خانِ اعظم کے لیے جو دعائیں مانگیں وہ حسبِ خیال ہیں :۔

نواب غوث خاں کے لیے عرض ہے یہی
مانندِ خضر عمر ہو اس کی دراز و طول
کعبہ میں پہنچ کر یہ دعا مانگئے لطیف
یارِ ہمارے شاہ کی منت عمر ہو دراز
کمی کس بات کی ہرگز نہ ہو گی
کسی سید کی اس گھر کو دُعا ہے

کعبہ شریف سے واپس آنے کے بعد لطیف کا طبعی میلان ایک نئے رُخ کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ جس کا اظہار اپنے اشعار میں یوں کرتا ہے :۔

دل میں آتا فقیر ہو جانا
یا کسی کے اسیر ہو جانا

اہلِ باطن کی فیضِ صحبت سے
مثلِ روش ضمیر ہو جانا

رختِ دنیا کو کر کے خاکِ تر
عاشقِ بے نظیر ہو جانا

آخر ش ایک دن لطیف کی تلاش و جستجو کا دامن کامیابی و کامرانی

کے پھولوں سے بھر جاتا ہے اور وہ بھی اپنی عمر کی آخری ساعتوں میں :۔

میں جو پیری میں پیر کو پایا
خضر سے دستگیر کو پایا

دل مرا جس طرح سے چہتا ہے
ویسے روشن ضمیر کو پایا

چاہتا ہے

دل مرا کیوں نہ اب منور ہو
میں نے مہرِ منیر کو پایا

بعدِ مدتِ لطیف قسمت سے
مرشدِ بے نظیر کو پایا

آخر میں وہ اپنے پیر و مرشد کے ترفع کا اظہار بھی کرتا ہے :۔

اے شہابِ اوجِ عزتِ واقفِ اسرارِ دین
ہمچو نورِ صبحِ روشن، کاشفِ علمِ یقین

اور پھر اعترافِ فیضانِ پیر کی ایک تصویر یوں روشن

کر دیتا ہے :۔

یا الہی تابہ دورِ جہومہ تابندہ دار فیض مولانا شہاب الدین بروئے زمیں
لطیف کے عصر شعراء | لطیف کے معاصر مدراسی شعراء
میں :

۱۔ غلام اعز الدین خان بہادر نامی ۱۱۸۱ء تا ۱۲۴۵ء م ۱۷۶۷ء تا ۱۸۴۷ء
مصنفِ مثنوی 'توبہا عشق'، 'بہارستانِ عشق'، 'سلیمان نامہ'
اور 'داغستانِ عشق'۔

۲۔ نور الدین خان محمد حشمت: ۱۲۵۴ء تا ۱۲۶۹ء م ۱۷۸۹ء تا ۱۸۵۲ء ع
۳۔ خانِ عالم خان فاروق: ۱۲۵۷ء تا ۱۲۷۱ء م ۱۷۹۶ء تا ۱۸۹۲ء
۴۔ مولوی عبدالقادر ناظر ۱۲۵۵ء تا ۱۲۴۳ء م ۱۷۸۵ء تا ۱۸۲۷ء ع

ط مولانا سید شہاب الدین سے متعلق:

پروفیسر میر محمد حسین اپنے مضمون "ویلوں نامہ" میں رقم طراز ہیں کہ مولانا ایک زمانے
تک ویلوں میں سکونت پذیر تھے اور وہ اپنی آخری عمر میں بیسور آئے اور بیسور ہی میں
داعی اجل کو لبیک کہا۔

جناب اکرام کاوش مولف "داستانِ بیسور" (مطبوعہ ۱۹۸۹ء) لکھتے ہیں کہ مولانا مدرسہ
لطیفیہ ویلوں کے فارغ التحصیل تھے اپنی آخری عمر میں سری رنگ پٹن آئے اور وہیں اپنے
آبائی مکان بنام "قادر اولیاء مکان" میں رہتے تھے۔ مولانا اپنی آخری سانس تک سلوک و
معرفت کی تعلیم دینے میں مصروف رہے۔

مولانا راہی فدائی اپنی تازہ ترین تحقیق کے مطابق تحریر فرماتے ہیں: مولانا حضرت قبلہ
قطب ویلوں کے خلیفہ بھی تھے۔

۲ محمد منور خان گوہر مدراسی "سمنو، این بلذ فکر" (مطبوعہ ۱۹۳۷ء) (بقیہ جاشیہ اگلے صفحہ پر)

۵۔ لطف النساء ایشیم آرکاٹی : ۱۲۶۶ء تا ۱۳۴۱ء م ۱۷۴۹ء تا ۱۸۲۵ء
مصنف مشنوی ”گلبن مہ رخاں“، ”گلشن مہوشان“ اور ”گلشن شاہدان“
کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔

مندرجہ بالا پانچوں شعراء کا ترجمان فارسی شاعری کی طرف بہت زیادہ
تھا۔ حالانکہ یہ شعراء اپنے دور کے اچھے اور معتبر شاعروں میں سے تھے۔ مگر ان کے شعری
کارناموں کی رسائی صرف مدراس کے خاص الخاص حلقوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی
اور ان شعراء میں شمالی ہند کے ادبی مسلمات سے انحراف کرنے کی ہمت تھی نہ ان
کی کھینچی ہوئی لکیر سے آگے بڑھنے کی جرات..... مگر لطیف اپنی بھرپور شعری
صلاحیتوں کے ساتھ شمالی ہند کے شعراء میں برابر کا شریک رہا۔ کہتا ہے : ۵
نہ سمجھو فکر تازی ہے سخن میں آج کل میری میاں ہندوستان تک تو گئی اکثر غزل میری
اعیہ نے اپنے کلام میں شمالی ہند کے ان شعراء کی مذمت بھی کی ہے
جو اپنی عالمانہ استعداد کا سکہ اوروں پر بٹھانے کے لیے فارسی میں شعر
کہتے تھے۔ ۵

(گزشتہ صفحہ کا حاشیہ) ۳ ”محبوب الزمن“ (جلد دوم) عبد الجبار ملکاپوری
”خانوادہ بدرالدولہ“ مولانا یوسف کوکن عمری (مطبوعہ)
۱۔ ایشیم آرکاٹی - تاریخ ولادت اور وفات حضرت کاوش بدری کے مضمون
”آرکاٹ کے قدیم شعراء سے لی گئی ہے۔“

”مدراس کی ایک جید شاعرہ“ سخاوت مرزا (مطبوعہ ”لوائے ادب“

مبئی ۱۹۵۴ء اور ”تذکرہ نسوان ہند“ فصیح الدین بلخی - بہار

مطبوعہ ۱۹۵۶ء

فارسی شعر کے کہنے میں نہ تم لاف کرو پہلے ہندی میں تو کچھ اپنی زبان صاف کرو
جو کہ اپنی ہی زبان کہنے میں فصیح نہ ہوا فارسی اس سے کہاں بنتی ہے انصاف کرو

لطیف نے اپنی زبان کو ہندی بتاتے ہوئے یوں کہا ہے : ۷

وضع میری اگرچہ رندی ہے پر فصیح ہوں زبان ہندی ہے
شعر گوئی کے دعویٰ کے سلسلے میں لطف کا شعر بھی قابل ذکر ہے :
شعر گوئی کا جو کرے دعوئے خود نمائی ہے خود پسندی ہے

لطیف کے ہم عصر شعراء شمالی ہند میں | شمالی ہند کے شعراء
میں مرزا رفیع سودا

۱۶۱۳ء تا ۱۷۸۱ء، خواجہ میر درد ۱۷۱۹ء تا ۱۷۸۴ء، میر تقی میر ۱۷۲۲ء تا
۱۸۱۵ء، انشاء اللہ خان انشاء ۱۷۵۶ء تا ۱۸۱۷ء، انعام اللہ خان یقین
جبرأت اور بہادر شاہ ظفر ۱۷۷۵ء تا ۱۸۶۳ء کے علاوہ لطیف کے دیوان میں
کسی اور کا ذکر نہیں ملتا۔ حالانکہ اسی دور میں شمالی ہند میں ابراہیم ذوق
۱۷۸۹ء تا ۱۸۶۹ء، مومن خان مومن ۱۷۹۸ء تا ۱۸۵۱ء کے نام بھی قابل ذکر
ہیں۔ پتہ نہیں لطیف نے ان شعراء کا نام کیوں نہیں لیا۔۔۔ اس سے ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ لطیف کے اندر انانیت کا عنصر بدرجہ اتم موجود تھا۔ اس
لیے کہتا ہے : ۷

اشعار ماسلف کا مشتاق ہوں تو میں ہوں شعراء ہم عصر میں مشتاق ہوں تو میں ہوں
۔۔۔ بہان تک لطیف خواجہ میر درد سے بھی اپنے آپ کو بہت زیادہ
دور بین دماغ رکھنے والا شاعر سمجھتا ہے۔ ۷

حضرت میر درد سے زاید دُور میں دماغ رکھتا ہوں
بھری لطیف نے اپنے کلام میں سودا کی بہت زیادہ تعریف کی ہے۔

اور شاعری میں اس کی تقلید کو خاص طور پر پسند کیا ہے اور شمالی ہند کے جن شعراء سے اُسے عقیدت تھی اس کا ذکر بھی کیا ہے۔

سودا سے میر درد سے، جرأت بقین سے انشاء سے اور تقی سے عقیدت مدام ہے
(میر تقی میر)

جس دور میں لطیف کی شہرت آرکاٹ سے نکل کر دلی تک پہنچی تو بہادر شاہ ظفر نے اس کو طرحی مصرع بھیج کر غزلیں بھی لکھوائیں۔ یہاں نمونہ چند شعر پیش ہیں : ۛ

قلم تراش سے مت استخوان تراش کے پھینک

رداں نہ ہو تو قلم کی زباں تراش کے پھینک

اگر بہار کی رکھتا ہے آرزو دل میں !!!

تو گل کے واسطے شاخ خزاں تراش کے پھینک

لکھا لطیف کو شاہ ظفر یہی مصرع

قلم تراش سے مت استخوان تراش کے پھینک

اچھی شاعری نہ تو علم کے بل بوتے پہ ہوتی ہے نہ لفظوں کی سجاوٹ اور

آرائش سے۔ ہاں بقول ڈاکٹر نجم الہدیٰ علوم و شعور کی ترقی سے شاعری ترقی

ضرور کرتی ہے۔ جہاں تک راقم کا خیال ہے میں یہی کہوں گا کہ اچھی شاعری میں

جذبہ اور فکر بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں یہ اور بات ہے کہ کسی شاعر کے ہاں

صرف جذبے کی فراوانی ہوتی ہے تو کسی کے ہاں فکر کی گہرائی اور گیرائی اگر یہ

دونوں عناصر (یعنی جذبہ و فکر) ایک ساتھ ہوں اور دونوں کی سطحیں اور لہریں

متوازن ہوں تو شاعر کو آفاق گیر شہر تیں نصیب ہو جاتی ہیں۔ غالب کو اردو

ادب میں نیک نامی اور آفاقیت عطا کرنے والے یہی دو عناصر ہیں۔ لطیف

غالب کا ہم عصر ہونے کے باوجود اردو ادب میں وہ مقام نہیں پاسکا جو غالب کو نصیب ہے۔ کیوں کہ لطیف کی شاعری میں صرف جذبے کی نشریت ہے جو فوراً دل میں اتر کر دل کی کائنات کو اپنی باہوں میں لے لیتی ہے مگر فکر کے اعتبار سے ایک آج کی کسر باقی رہ گئی تھی۔

ہماری اردو شاعری میں رمزیت کے جو کمالات ملتے ہیں وہ یقیناً دوسری زبانوں کے ادب میں ناپید ہیں۔ اردو شاعری میں رمز و کنایہ، اہمایت اور تشبیہ و استعارات کی وجہ سے ایک خاص حسن، دل کشی اور تاثر پیدا ہو جاتا ہے اور شاعر کا فانی الضمیر اپنی بھرپور توانائی کے ساتھ سامع کے ذہن میں اجاگر ہو جاتا ہے۔

غالب کہتا ہے: ہ

ہر بوا اہوس نے حسن پرستی شاعر کی

اب آبروئے شیوہ اہل نظر گئی

ہ

مشرّب تو عاشقی کا بہت سخت ہے لطیف

ہر بوا اہوس سے سمجھ کو نبھایا نہ جائے گا

(سج)

غالب

رشتک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص

عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

لطیف

دنیا میں سوز و درد کسی کا کسے نہیں

دیکھو تو جن کو اپنے ہی مطلب کا آشنا

(کسی کو)

غالب کے ہاں جوں و بہجہ کی متانت، زبان و بیان کی سنجیدگی،

الفاظ کی بندش، جذبہ اور فکر کی نئی رنگینیاں ملتی ہیں اُس کی اُمید لطیف کے

ہاں بے سود ہے اور غالب کی غزلوں میں جو کلاسیکی رچاؤ اور موسیقیت کی جو

جادوگری ملتی ہے وہ کسی اور شاعر میں موجود نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب ہماری شاعری کی کائنات پر چھایا ہوا نظر آتا ہے اور آئندہ بھی اسی طرح شعری دنیا پر مسلط رہے گا۔

چلیے اب ہم ذرا لطیف کے معاصر شعراء کی شاعری اور اس تناظر میں جو عکس ابھرتے ہیں ان کے خدو خال پر بھی ایک نظر ڈالیں: ۛ

بہادر شاہ ظفر ۛ
روز معمرہ دنیا میں خرابی ہے ظفر
ایسی بستی سے تو دیرانہ بنایا ہوتا
لطیف ۛ

بھول مت آبادی دنیا پہ اے مردِ جہاں کام ہے درپیش آخر سب کو دیرانے کے سا
یہ دونوں شعر ہم مرتبہ ہیں اور یہاں لطیف و ظفر دونوں ایک ہی مقام
اور مرتبہ پر نظر آتے ہیں۔

مومن خان مومن: ۛ

مانگا کریں گے اب سے دعا بھر یار کی آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ
اسی زمین میں لطیف کہتا ہے: ۛ

ناحق جو ہم خراب ہوئے دلریا کے ساتھ اے کاش دل لگاتے ہم اپنے خدا کے ساتھ
لطیف اور مومن ہم عصر ہونے کے باوجود دونوں کے موضوعات اور
خیالات ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں لیکن مومن کا شعر نزاکت خیال
اور تغزل کی بہترین مثال ہے۔

سودا: ۛ

جو گزری مجھ پہ مت اس سے کہو ہوا سو ہوا بلاکشانِ محبت پہ جو ہوا سو ہوا
اسی زمین میں لطیف کہتا ہے: ۛ

گنہ جو کر چکے پھر مت کرو ہوا سو ہوا کرم تو حق ہے، نصیب سے ڈرو ہوا سو ہوا
اس شعر میں لطف کی پرواز سودا کی اڑانوں سے زیادہ تیز ہے۔

میر تقی میر کی غزل کا یہ شعر بہت مشہور ہے : ۵

کل لے گئے تھے یار ہمیں بھی چمن کے بیج کہہ دیجیے صاف صاف اسی انجن کے بیج
جیسا کہ میر تقی میر کو ناقدینِ ادب اور شعرائے شمالی ہند نے اردو شاعری کا میر
تسلیم کیا ہے اُسی طرح جنوبی ہند میں لطیف بھی اپنے دور کا واحد شاعر تھا
جس نے اپنی زندگی میں نہ سہی لیکن اپنی وفات کے سو سال بعد بھی ٹل ناڑو کے
شعری ادب اور عوام کے ذہنوں میں اپنی خاص جگہ متعین کر چکا ہے۔ آج بھی
اس کے متعدد اشعار زبانِ زد خاص و عام ہیں اور روزمرہ زندگی میں ضرب
المثل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

غالب کا یہ شعر لیجیے : ۵

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

لطیف کہتا ہے : ۵

”اہلِ وفا سے کام جو رکھتا ہے روز و شب شکوہ نہیں ہے اس کو کسی بے وفا کے ساتھ
غالب کا شعر محض بیانیہ ہے اور اس کی مایوسی کا منظر ہے مگر یہاں لطیف کے
شعر میں ایک طرح کی رمزیت اور لطیف طنز پوشیدہ ہے۔

غالب کہتا ہے : ۵

حُسنِ فروغِ شمعِ سخنِ دور ہے اسد پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

لطیف کہتا ہے : ۵

خاکساروں کے قدم کی گرد پیدا کیجیے شعر کہنا ہو تو پہلے درد پیدا کیجیے
ان دونوں اشعار میں غالب کی لفظیات بہت خوب صورت ہیں۔ یہاں غالب

کہتا ہے کہ وہی شعر دلوں پر اثر انگیز ہوتا ہے جس میں گداز ہوا اور اس اثر کے لیے اہل سخن کے دل میں گداز کا ہونا ضروری ہے۔ شمع سخن کے فروغ کا لہزہ اسی گداختگی میں پوشیدہ ہے۔ مگر لطیف درد کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اپنے شاعر دوستوں کو مشورہ دیتا ہے کہ شعر کہنے کے لیے پہلے دل میں درد کا ہونا نہایت ضروری ہے۔

غالب کا یہ شعر بھی آج تک ہمارے ذہنوں میں محفوظ ہے : ۛ
 کتنے شیریں ہیں تیرے لب کے رقیب گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا
 لطیف اسی خیال کو بہت عامیانا انداز میں یوں پیش کرتا ہے : ۛ
 گالی کا غم نہ کیجے کسی حال میں لطیف گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا
 غالب نے یہاں ایک بلند مقام سے گالیوں کے تعلق سے اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا ہے اور اس کے عشق کے بارے میں جو خیالات ہیں انھیں کا ایک حصہ ہیں مگر لطیف کے ہاں گالیوں کا ردِ عمل بہت معمولی اور سطحی ہے۔
 آخر میں غالب کا یہ شعر بھی سن لیں جس کی گونج سے لطیف متاثر ہو کر کچھ کہنے کی کوشش کرتا ہے : ۛ

غالب : ۛ

یہ مسائل تصوف یہ تیرا بیان غالب تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

لطیف : ۛ

عبث فکر سخن میں میں کیا ہوں عمرِ کزائے اگر ذکرِ خدا کرتا تو میں بے شک ولی ہوتا

غالب نے اپنے شعر میں مسائلِ تصوف کو اس طرح بیان کیا ہے جس طرح کوئی بادہ خوار بیان نہیں کر سکتا بلکہ وہ کہتا ہے کہ مسائلِ تصوف کو پیش کرنے کا حق ایک ولی ہی کو عطا ہے۔ یہاں لطیف تصوف اور اس کے مسائل کے سلسلہ

میں بہت معصوم لگتا ہے۔

اگرچہ لطیف نے اپنے کلام میں کہیں بھی غالب کا تذکرہ نہیں کیا ہے مگر یہ کہ دینا ضروری ہے کہ لطیف نے غالب کی فکر اور مضمون دونوں میں اپنی فکری جولانیاں دکھائی ہیں تو وہ ضرور غالب سے بھی متاثر رہا ہے اور ممکن ہے کہ غالب کو بھی لطیف کی شناسائی حاصل تھی۔۔۔۔۔ دونوں میں کسی طرح کی رسم و راہ نہ ہونے کی وجہ سے غالب نے بھی لطیف کا ذکر کہیں نہیں کیا۔

میں نے اس مضمون میں لطیف اور غالب کا تقابلی مطالعہ کے بعد جن نتائج کا استنباط کیا ہے اس کا مطلب و مقصد ہرگز یہ نہیں کہ لطیف کی شعری عظمت کو گھٹایا جائے بلکہ یہ کہ لطیف کے دور میں شمالی ہند میں جن شعراء کا چرچا اوج پر تھا اور شاعری کی جو آوازیں گونج رہی تھیں محض ان کا سرسری جائزہ لینا ہے۔ لطیف کے کلام کے مطالعہ کے بعد اتنی بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ لطیف کی شاعری میں اپنے دور کے ہم عصر شعراء کی بڑی لطیف باز گشت سٹائی دیتی ہے۔ وہ ایک ایسے ماحول کا پروردہ تھا جہاں اس دور میں شمالی ہند کے کسی شاعر کا کبھی گزر نہیں ہوا تھا۔ اور وہ بالکل تنہا اپنے ہی ماحول میں اپنی فکری پرواز کو قائم رکھے ہوئے تھا۔ اسی سے لطیف کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔

بحیثیت مجموعی تیرھویں صدی کے شعراء کے پاس جو خیالات ملتے ہیں

وہی خیالات و افکار لطیف کے ہاں بھی موجود ہیں۔ خصوصیت سے اخلاقی انحطاط سماج کے غلط رسم و رواج، اہل دولت اور اہل رکاری تعیش پسندی، نوجوانوں کی بے راہ روی، غرور و تکبر سے بے زاری، دنیا کی مکاری کی بہترین عکاسی لطیف نے اپنے کلام میں کی ہے۔ انگریزوں اور ٹیپو سلطان کی معرکہ آرائیوں کے مبہم اشارے اور ٹیپو سلطان کو انگریزوں کی ختم کرنے کی وہ سازشیں جو مقامی راجاؤں

اور نوابوں کے ساتھ مل کر کی گئی تھیں ان کا ذکر اشاروں اور کنایوں میں بڑے لطیف اور طنز و مزاح کے انداز میں کیا ہے۔

لطیف کی شہرت اور عظمت کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ اس نے اپنے دور کے عام لوگوں کے احساسات کی ترجمانی ان کی ہی اپنی زبان میں کی ہے اور لطیف غزل کا شاعر ہونے کے باوجود اس نے اکثر و بیشتر غزل کے فارم کو نظم کی طرح استعمال کیا اور اس استعمال میں ایک حد تک زیادتی برتتے ہوئے غزل کے اطراف جو نزاکت کا ہالہ بنا ہوا تھا اُسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا مگر اس توڑ پھوڑ کے باوجود لطیف کی غزل ہزل نہیں بنی جس کا اردو میں رواج رہا ہے۔ یہی لطیف کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

لطیف ویسے بھی تمل ناڈو کا وہ واحد خوش قسمت شاعر ہے جس کی وفات کے ایک سو سال بعد بھی اس کی تلاش و جستجو کا سلسلہ آج بھی جاری ہے اور اس کی شعری لطافتوں کی روشنی تمام ذہنی گوشوں میں اپنی بھرپور رنگینیوں کے ساتھ موجود ہے۔

کیوں نہ باقی رہے دنیا میں ترانام لطیف لطف سے حق کے جو تو صاحبِ یوان بنا
لطیف کا انتقال ۱۸۷۶ء میں بمقام آرکاٹ ہوا اور اسد پور میں تدفین عمل میں آئی آج بھی لطیف کا مزار مشہور بزرگ ولی کامل حضرت شیواولیا کے روضہ کے قریبی احاطہ میں منور و معطر ہے۔
اک قبر فقط مری منور ہے نہ سمجھو کوئین میں ہے شمع رسالت کا اُجالا

یہ مقالہ اسلامیہ کالج دانم باڑی کے جشنِ یومِ اردو میں پڑھا گیا (۱۹۹۰ء)

مولانا ہادی فدائی کی تازہ ترین تحقیق کے مطابق راقم الحروف کو بھی اس مزارِ مبارک پر حاضری کی سعادت حاصل ہوئی۔



نواب تجمل حسین خان ایمان گوپاموی

نواب تجمل حسین خان ایمان گوپاموی کا تعلق اگرچہ تامل ناڈو سے نہیں تھا، لیکن اُن کے ذہنی نشو و نما اور عملی و ادبی خط و خال کو اجاگر کرنے میں اسی سرزمین کا بہت بڑا حصہ ہے۔ نواب ایمان نے یہیں سے اپنی قابلیت و صلاحیت کا پرچم لہرایا۔ اور ان کی شہرت کا سورج بھی تامل ناڈو کے افق سے طلوع ہوا۔ نواب ایمان بمقام گوپامو (اتر پردیش) 1277ھ م 1860ء میں پیدا ہوئے ان کا سلسلہ نسب تقریباً چونتیس³⁴ واسطوں سے خلیفہ دوم حضرت فاروق اعظم تک پہنچتا ہے۔

نواب ایمان کی ابتدائی تعلیم گوپامو میں ہوئی اور بقول پروفیسر محبوب پاشا (ابن ایمان گوپاموی) مولانا محمد اکرم گوپاموی سے فقہ و حدیث مولانا خیر الدین گوپاموی سے تفسیر و اصول اور مولانا عبدالحق خیر آبادی سے معقولات کی سندیں حاصل کیں۔ لے

لے (قصائد ایمان)

نواب ایمان کا خاندان نواب انور الدین خان کے زمانہ میں مدراس
 آچکا تھا۔ نواب انور الدین خان جو مضافات لکھنؤ کے ایک قریہ گویا مو کے رہنے
 والے تھے کرناٹک (آرکاٹ) کی صوبہ داری کے عہدے پر فائز ہونے کے بعد
 نواب انور الدین خان ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ پھر ان کی فتدرانی
 حوصلہ افزائی اور قرباء پروری کی وجہ سے ان کے خاندان کا ہر فرد مدراس کا رخ
 کرنے لگا اور تقریباً ایک صدی تک یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ اس سلسلہ
 کی آخری کڑی نواب ایمان گویا موسیٰ تھے۔

نواب ایمان کے والد حافظ دلی احمد کے انتقال کے بعد ایمان
 ۱۲۹۷ھ کی عمر میں اپنی والدہ نیا زفاطمہ کے ساتھ حیدرآباد ہوتے ہوئے ۱۲۹۷ھ
 میں اپنے چچا رفعت الملک بہادر (دامادِ نواب عظیم جاہ بہادر پرنس آف آرکاٹ)
 کے پاس مدراس آئے۔ نوابین آرکاٹ کا یہ وہ سنہری دور تھا جب کہ شمالی ہند
 سے اہل علم و فن، اربابِ ادب، نکتہ رس و نکتہ دان اور سربراہ اور وہ علمائے
 وقت نوابین آرکاٹ کے دربار کی طرف کھینچ کر آ رہے تھے۔ نوابین آرکاٹ کی علم
 دوستی اور قدر دانی کا یہ عالم تھا کہ اہل علم و فن کے لیے اپنے بیش بہا خزانے
 لٹائے جا رہے تھے۔ مولانا ابوالجلال ندوی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اہل علم
 جب مدراس کی طرف رجوع کرتے تو شمال کے اربابِ علم و فن سے خاص طور پر
 یہ تاکید فرماتے تھے کہ ”مدراس جانے کے بعد اپنی زبان پر قابو رکھنا کہیں ایسا نہ
 ہو کہ وہاں کے اہل علم کے آگے ہمارا بھرم کھل جائے۔“
 مدراس آنے کے بعد ایمان نے اپنے چچا نواب رفعت الملک بہادر سے

ملاقات کی۔ نواب رفعت الملک نے بڑے چاؤ، محبت اور خلوص سے ان کی سرپرستی قبول فرمائی۔ چنانچہ ایمان نے مدراس آنے کے بعد اپنے وقت کے جید علماء اہل نظر، اہل دل حضرات مثلاً طراز شاہ خان، مولوی غلام دستگیر بہت اور مولانا الحاج عبدالوہاب (بائی مدرسہ باقیات صالحات) سے بھرپور استفادہ ہی نہیں کیا بلکہ ان حضرات کی صحبتوں سے فیض یاب بھی ہوئے۔ مولانا ایمان نے مولانا الحاج عبدالوہاب کے دست مبارک پر بیعت سے مشرف ہوتے ہوئے خلافت کی روشن منزل بھی طے کی۔

مولانا ایمان کی علمی، ادبی اور دینی قابلیت سے بے حد متاثر ہو کر نواب انتظام الملک بہادر پرنس آف آرکاٹ، سوم نے اپنی چوتھی صاحبزادی سے ان کا بیاہ کیا۔ اس وقت ایمان کی عمر بیس سال تھی۔ نواب انتظام الملک کی دامادی کا یہ اثر ہوا کہ ایمان نہایت یکسوئی اور طمانیت قلب کے ساتھ علمی اور ادبی خدمات کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو گئے۔ ایمان کی ہستی ہر اعتبار سے جامع الصفات تھی۔ مختلف علوم پر عبور حاصل ہونے کی وجہ سے مدراس کے ادبی اور علمی ماحول میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ اُس وقت کے جلیل القدر علماء ایمان کی استعداد، تبحر علمی، ذہانت و فطانت اور اخلاق و اوصاف کے دل سے معترف ہی نہیں تھے بلکہ ایمان کا خاص احترام بھی کرتے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب کہ سید ضامن علی جلال لکھنوی کا سارے ہندوستان میں طوطی بول رہا تھا۔ شعراء جلال لکھنوی سے شرف تلمذ حاصل کرنا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ اس دور میں جلال کی زبان دانی، نکتہ رسی اور فن و ادب پر بھرپور دسترس مسلم تھی۔ ایمان کو چونکہ بچپن ہی سے شاعری سے فطری تعلق تھا۔ رفتہ رفتہ ایمان کے شعری جوہر اجاگر ہونے لگے اور ان کی طرح ایمان نے بھی اصلاحِ سخن کے لیے حضرت جلال لکھنوی کو منتخب

کیا۔ ابتداء میں خط و کتابت کے ذریعہ اصلاح کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر ایمان نے کئی مرتبہ بالمشافہ لکھنؤ اور رام پور جا کر استاد کی خدمت میں حاضری دی۔

ایمان کی شاعری کا مقام بہ اعتبارِ زبان و فن بہت اونچا ہے۔ ان کی تخلیقات کے غائر مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ایمان نے شعوری طور پر جلال و داغ کے لہجہ کا بیک وقت اثر قبول کیا ہے۔ ایمان کے ہاں رعایت لفظی، صنائعِ بدائع اور محاورات کا صحیح استعمال ملتا ہے۔ ایمان کا فکری سفر گنجملگ اور عبید از قیاس راستوں میں گم نہیں ہوتا بلکہ ایک متوازن فضا میں جاری رہتا ہے۔ ایمان نے مختلف اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ ہر صنف میں ان کی صلاحیت و استعداد کے جوہر کھل کر سامنے آتے ہیں۔ ایمان چوں کہ ایک جسدِ عالم، شیوہ بیان مقرر اور السنۃ مشرقیہ کے ماہر تھے ان کی تخلیقات میں تغزل کی لطافت کے ساتھ ساتھ فکر و نظر اور شدتِ احساس کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ انہوں نے اپنی نگارشات سے ایک دور کو متاثر کیا۔ بعض شعراء کی ایمان سے معاصرانہ چشمیں بھی ہوتی تھیں لیکن یہ چشمیں کسی ذاتی منافرت اور ذاتی عناد کی بنا پر نہیں ہوتی تھیں بلکہ تہذیب و شائستگی کی فضا میں اربابِ علم و فن کو غور و فکر کا سامان مہیا کرتی تھیں۔ ایمان کا حلقہٴ تلامذہ بھی نہایت وسیع تھا۔ ایمان معاشی ضروریات سے بالکل بے نیاز تھے۔ انتظام الملک بہادر کی صاحبزادی سے شادی کرنے کے بعد انہیں خوب آسودگی کے دن نصیب ہوئے۔ عام طور پر آسائش و فراغت کے ایام میں انسانی ذہن جیلی طور پر غلط راستوں میں بھٹک جاتا ہے۔ نفس کی تسکین اور طمانیتِ قلب کے لیے انسان ایک ایسا ماحول پیدا کر لیتا ہے جہاں آسائش کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ بعض لوگوں نے شاعری کو بھی ذہنی عیاشی کہا ہے، لیکن راقم کا خیال ہے ہر زبان کی تاریخ میں

شاعری کے تعلق سے کچھ ایسے واقعات بھی ملتے ہیں کہ شاعر نے قوموں کی تقدیر بدلے میں اپنی زبان اور قلم سے بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ ایمان آسودہ حال ضرور تھے لیکن حب رسولؐ اور آلِ سیدِ لولاکؑ سے ان کی دلی وابستگی کا یہ عالم تھا کہ ان کے ذکر سے ایمان پر رقت انگیز کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ایمان نے اپنے وقت کے تفاضلوں کے پیش نظر غزل کا بھی پورا پورا حق ادا کیا۔ لیکن رفتہ رفتہ جب قویٰ میں اضمحلال پیدا ہو گیا تو ان کی تمام تر توجہ نعت گوئی کی طرف مبذول ہو گئی۔

ایمان اخلاقی اعتبار سے درویش صفت اور فقیر مشرب تھے۔ سیر علمی کے باوجود ایمان کی انا کبھی نخوت سے ملوث نہیں ہوئی۔ طبیعت میں بڑی سادگی تھی۔ ہر ایک سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے تھے۔ تواضع، وضعداری اور خوش اخلاقی کی خصوصیات ان کی طبیعت میں اس طرح مجتمع تھیں کہ ملنے والا دل سے ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔

ایمان نے بہت طویل عمر پائی تھی۔ انہوں نے بیاسی سال کی عمر میں (1359ھ / 1940ء) میں وفات پائی اور مسجدِ والا جاہی کے صحن میں سپردِ خاک کئے گئے۔

کلام کا نمونہ

نعت

سامنے فوج مضامین کی کھڑی رہتی ہے
بے گناہی ہے کہ مایوس کھڑی رہتی ہے
پھر اُسے کوئی نہ سنجی نہ کڑی رہتی ہے
رات دن مجھ کو یہی فکر بڑی رہتی ہے

نعتِ احمدؐ سے طبیعت جو لڑی رہتی ہے
بڑھ کے بخشش تری لیتی ہے گنہگاروں کو
سہل کر دیتے ہیں جس شخص کی مشکل کو حضورؐ
زندہ پہنچوں گا مدینہ کو پس مرگ ایمان

دل ہجرت میں چاک نہیں ہے تو کچھ نہیں
اتنی بھی دل میں دھاک نہیں ہے تو کچھ نہیں
اور خوف و بیم و باک نہیں ہے تو کچھ نہیں

عشق رسول پاک نہیں ہے تو کچھ نہیں
ناخوش حضور ہوں گے جو طاعت میں ہوں
نادم گنہ سے ہوں تو ہے رحمت کی کچھ اُمید

کہ ہم کو دیدارِ رسولؐ کی ہو گی
وہ کہئے کیسی مصیبت کی زندگی ہو گی
ترے خزانہ رحمت میں کیا کمی ہو گی

بڑی خوشی تو اُسی روز کی خوشی ہو گی
جو ہجرت میں بسر ہو رہی ہے رو دھو کہ
مرے کریم جو تو بخش دے گا ایمان کو

غزلیں

مگر ہر کہ وہ کم بخت بانی شر تھا
فلک تھا، آپ تھے، دل تھا، اُمید تھا
کہ ایک ہاتھ جگر پر تھا، ایک دل پر تھا

زباں پر ان کی مراد کر خیر اکثر تھا
ہر ایک عشق میں میرے لیے ستمگر تھا
شبِ فراق اٹھاتے پے دُعا کیوں کر

ترے دیوانے ہوں کیا خاک دست انداز دامن پر
کہاں سے لائیں دامن، پیر بہن ہی جب نہیں تن پر

وہ نالے مکیبل ناشاد کر شاخِ نشیمن پر
گلوں کا دل پھر ٹک جائے تری فریاد و شیون پر

نہ کامل نکتہ دانوں میں، نہ شامل خوش بیانوں میں
تجھے ایمان پھر کس علم پر ہے ناز کس فن پر

وسعت مرے دل میں نہیں ارمان بہت ہیں

مشکل ہے کہ گھر تنگ ہے، جہان بہت ہیں

ساقی ترے شیشوں سے فزوں دل ہیں شکستہ

پیمانوں سے ٹوٹے ہوئے پیمان بہت ہیں

دشوار ترے عشق میں نکلی وہیں باتیں !

ہم جن کو سمجھتے تھے کہ آسان بہت ہیں

ایمان کدھر دیکھتے ہو، دھیان ہے کس کا

کیا وجہ ہے نظریں جو پریشان بہت ہیں

وہ تو جھلک دکھا کے پس پردہ ہٹ گئے

ہم بے خودی میں دوڑ کے پٹ سے لپٹ گئے

خجھر بکف گزر گئے اپنی گلی سے

کچھ یہ بھی ہے خبر کہ گلے کتنے کٹ گئے

جتنے تعلقات تھے آخر کو عشق میں

کچھ ہم نے قطع کر دئے کچھ خود ہی کٹ گئے

کعبہ میں شیخ، دیر میں ہم، میکدہ میں رند

سب اپنی اپنی دھن میں ترانہ نام لے گئے

ایمان بعدِ مرگ جو مٹی بتوں نے دی

دل کے گرہ بھی گور کے ساتھ اپنے پٹ گئے



مولانا عبدالحی احقر بنگلوری

دکن سے اور اردو کا رشتہ اس قدر قدیم اور مسلم ہے کہ اس کے ثبوت کے لیے تاریخی حوالہ جات کی آج کل ضرورت نہیں محسوس ہوتی ہے۔ اس موضوع پر تاریخ ادب اردو کے بیشتر محققین اپنی پوری ذہنی توانائی اور روشنائی خشک کر چکے ہیں۔ تاہم قندِ مکرر کے طور پر کچھ عرض کرنا بے جا نہ ہوگا۔

سلطان علاؤ الدین خلجی (1296ء تا 1316ء) کے مشہور سپہ سالار ملک کافور نے 1309ء میں سب سے پہلے کرناٹک فتح کیا اور علاؤ الدین کی وفات (1317ء) کے بعد دوبارہ محمد بن تغلق نے 1361ء میں کرناٹک پر فتح و کامرانی حاصل کی تو اس کے فوجیوں کے ہمراہ مختلف زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان بھی سیاسی تجارتی اور لشکری مقاصد کے تحت شمالی ہند سے کرناٹک میں داخل ہوئی۔ اس دور میں شمال اور کرناٹک کے تعلقات میں بہت وسعت اور کشادگی پیدا ہوتی گئی۔ ربا مخصوص 1400ء میں جب کہ سلطان فیروز شاہ بہمنی نے وجیانگر کی شہزادی سے بیاہ

لالہ ہتھاب رائے سبقت اور محمد مخدوم شاگر وغیرہم نے اردو کے شعری سرمایہ میں نہ صرف اضافہ کیا بلکہ اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمت بھی کی۔ ان شعراء میں چند ایک میدانِ طریقت کے شہسوار بھی تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ شمالی ہند میں آبرو (المتوفی 733ء) فائز دہلوی (المتوفی 738ء) اور خان آرزو (المتوفی 756ء) کا دور ختم ہو چکا تھا اور حاتم (المتوفی 783ء) میر درد (المتوفی 784ء) مرزا رفیع سودا (المتوفی 798ء) اور قلندر بخش جرات (المتوفی 809ء) کا اردو شعر و ادب میں بہت شہرہ تھا۔ اس کی شہادتیں ہمیں اس دور کے لکھے ہوئے تذکروں میں ملتی ہیں۔

دورِ ٹیپو سلطان (1782ء تا 1799ء) میں زین العابدین (میر منشِ ٹیپو سلطان) حسن علی عزت، سید عارف شاہ قادری، میر حسن علی کرمانی حاکم، شاہ کمال الدین کمال، محمد علی مہکری خانہ زاد، محمد اسحاق اور عبدالحق جیسے شعراء، ادباء اہل علم اور اصحابِ فضل نے اپنی تصنیفات اور تالیفات کے ذریعہ اردو شعر و ادب کے ایک چھوٹے علاقے کے حدودِ اربعہ کو خاطر خواہ وسعت

۱۔ مصنف بڑی چہار کرسی۔ لالہ ہتھاب سخن (فارسی) 'شمع مجلس' (اردو)
 ۲۔ مصنف تحفۃ المجاہدین 1781ء لکھ مؤلف 'مفرح القلوب' جس میں موسیقی کے قواعد دکھائے گئے ہیں۔ ۳۔ مصنف مشنوی "حقوق المسلمین" 1224ھ
 ٹیپو سلطان کے حکم پر رسالہ "احکام النکاح" بھی ترتیب دی۔
 ۴۔ مصنف "نشان حیدری"۔ ۵۔ "مخزن العرفان" 1913ء لکھ مصنف "گنج شائگان"
 1806ء۔ ۶۔ مصنف "ریاض العارفین" 1276ھ لکھ مصنف "چھوٹی چار کرسی"۔
 ۷۔ مشنوی شگفتہ بحر صاف اور سادہ و کئی زبان میں بچوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ آج بھی اکثر گھروں میں ہر جماعت کو بعد نماز مغرب عورتیں بعد احترام ترنم سے پڑھتی ہیں۔

رچا کرد و سلطنتوں کے درمیان تعلقات استوار ہی نہیں کئے بلکہ وجیانگر کی قلمرو نے مسلمانوں کو ملازمتیں بھی دیں۔) جس کی وجہ سے اردو زبان کے بولنے والے کرناٹک کے مختلف مقامات پر پھیلتے چلے گئے۔

۱۴۹۵ء - ۱۶۸۶ء کے دوران بیجاپور میں عادل شاہی اور ۱۵۰۸ء - ۱۶۸۷ء کے دوران گولکنڈہ میں قطب شاہی حکومتیں قائم رہیں۔ ۱۵۶۵ء تا ۱۶۸۷ء کی جنگ کے بعد علاقہ کرناٹک میں مسلمانی حکومتیں پہلے کی بہ نسبت اپنا اثر و نفوذ اور زیادہ مستحکم کرنے لگیں۔ مسلمانوں کے مذہب، تہذیب اور تمدن کے ساتھ ساتھ اردو زبان کرناٹک کے دور دراز علاقوں میں پھیلنے پھولنے لگی۔ اس عام رجحان اور ان عمومی اثرات سے میسور کا علاقہ مستثنیٰ نہیں تھا۔ جہاں ۱۷۶۱ء میں سلطنت خداداد کے قیام سے پہلے کرناٹک کے شعراء ادباء اور علماء نے اردو زبان کی ترقی اور نشوونما میں بطور خاص توجہ دی۔ جن میں شمالی ہند، ترکستان، ایران اور عرب کے اہل علم و کمال کے علاوہ خود کرناٹک میں ملک الشعراء نصرتی، بیجاپوری، ہاشمی، بیجاپوری، عبدالمومن مومن (عادل شاہی دور کا آخری شاعر) اور شاہ محمد صدر الدین فرزند میراں شاہ ولی اللہ (المتوفی ۱۱۴۶ھ مدفون آدم بہاڑی، ضلع شمالی آرکاٹ) قابل ذکر ہیں۔

قیام سلطنت خداداد کے بعد عہد حیدری (۱۷۶۱ء تا ۱۷۸۲ء) میں محمد سعید عاصی المتوفی ۱۷۵۳ء، سید محمد شاہ میر المتوفی ۱۱۸۹ھ، خیر اللہ شاہ قادری خادم، فضل اللہ فقیر، سید حسین علی شہباز، احمد خان شیرانی، مصنف مثنوی "اسرار عشق" (۱۸۶۲ء تا ۱۸۹۳ء) تاریخ ادب اردو "ڈاکٹر جمیل جالبی۔ لے مصنف مصباح النور (نظم) "شرح مصباح النور" زشر۔ ۳ مصنف "انتباہ الطالبین" ۴ مصنف "چہار کر سئی طریقت"۔

بخشی۔

حیدر علی اور ٹیپو سلطان کا زمانہ بہت مختصر رہی پھر بھی اس عہد میں اردو زبان کے شعروادب اور علم و فن کی سرپرستی اور قدر دانی بہت زیادہ ہوئی۔ حالانکہ اس عہد کی دفتری زبان فارسی تھی لیکن ٹیپو سلطان کی جامع الصفات اور علم و دست شخصیت کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ موصوف نے اپنے دور میں مذہبی تعلیم کے ساتھ دوسرے بہت سارے علوم و فنون مثلاً فلسفہ، ریاضی، نجوم، طب کی تعلیم و تدریس کے لیے سری رنگین میں "جميع الامور نامی درس گاہ قائم کی۔ سلطان کو مختلف علوم و فنون پر کافی دست گاہ حاصل تھی اور تصنیف و تالیف سے بہت گہرا لگاؤ تھا۔ لہذا موصوف نے کرناٹک کے مسلم حکمرانوں کی طرح راجگان میسور نے بھی اردو زبان کی بھرپور سرپرستی کی۔ چنانچہ ٹیپو سلطان کی شہادت 1799ء کے بعد ہمارا جہ کرشنا راج و وڈیار اور اس کے متبئی چاراج وڈیار (نخت نشینی 1868ء) کے عہد میں بھی اردو کی ہر دل عزیزی اوج پر تھی۔ اس دور کے معروف ادبا، و شعرا میں میر حیات میسوری (وفات 1864ء)، سید عبداللطیف لطیف آرکاٹی (وفات 1876ء)، محمد قاسم غم (وفات 1861ء)، محمد حسین نسیم (وفات 1888ء)، محمد عبدالرحمن دل (وفات 1899ء)، عبدالحق تحقیق (وفات 1900ء)، عبدالحفیظ آرام (وفاتء)، سید شہاب الدین شہاب (وفات 1905ء)

۱۔ مصنف "مصابح الحیات" 1870ء، "خمسہ حیات" 1861ء، "شمع محفل" تعلیم نسوان

۲۔ دیوان لطیف، سنہ ۳۷ء مصنف "مثنوی غم" مطبوعہ 1853ء، "میر قاسم الاخبار" 1861ء یہ میسور کا پہلا اردو اخبار تھا جس کے تین سہ زیادہ شمارے منظر عام پر آئے۔ "دیوان نسیم" غز لو کا مجموعہ ہے لیکن مثنوی اور نثری تحریریں جس سے نسیم کی شخصیت اور فن کے نمایاں خدوخال آ جا کر ہوتے ہیں آج تک کتابی صورت نہ دیکھ سکے۔ اگر نسیم کی معرکہ الآرا تخلیقات منظر عام پر آجائیں تو نسیم کے مقام کے تعین میں بہت آسانی ہوگی۔ "میر شمع سخن" 1884ء۔ "میر ترغیب" 1889ء رسالہ نسوان، "مولانا شہاب دیلور میں پیدا ہوئے۔ مولوی غلام قادر مدرس کی خانقاہ میں علمی تعلیم حاصل کی۔ مولانا قطب دیلور سے بیعت و خلافت (بقیہ اگلے صفحہ پر)

محمد غوث جادو (وفات 907ء)، بدھن شریف آتم (وفات 918ء) منشی قلندر حسین
 اظہر، مولانا عبدالقادر علی صوفی (وفات 996ء) فرزند مولانا عبدالحق (احقر بنگوری)
 عبداللہ مستان (وفات 913ء) اور مولانا شاہ عبدالحق احقر بنگوری (وفات 1882ء)
 قابل ذکر ہیں۔ ————— مگر ان سب میں علم و فضل اور شرف و کمال
 کے اعتبار سے جو مقام و منزلت حضرت مولانا عبدالحق احقر بنگوری کو حاصل ہے وہ کسی
 اور کے مقدر میں نہیں۔ درحقیقت حضرت احقر نے مختلف علوم و فنون بالخصوص اردو
 زبان و ادب کی اشاعت و ترویج میں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ صرف کر دیا۔ آپ ہی کی واحد
 ذات تھی جس کی بدولت اسلامیات کا بہت زیادہ ذخیرہ اردو نظم و نثر میں منتقل ہوا۔
 یہ تاریخ کی ایک ستم ظریفی ہے کہ بعض اوقات مصنف کی اپنی تصنیفات اس قدر
 مشہور ہو جاتی ہیں کہ ان کی روشنی کے آگے قاری کو صاحب تصنیف کی طرف آنکھ اٹھا کر
 دیکھنے کی ہمت بھی نہیں ملتی۔ کچھ ایسا ہی معاملہ مولانا عبدالحق احقر بنگوری کے ساتھ بھی
 پیش آیا۔ آپ کثیر التصانیف شاعر و ادیب ہونے کے باوجود آپ کی زندگی کے مفصل
 حالات اور فن و شخصیت کے بسیط نورانی خدو خال آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہوتے

ص کا بغیر حاشیہ: کی متور زمر میں طے لیں قطب دیور کی شہور کتاب ”جوامع الحقائق“ پر اپنے مقدمہ لکھا ہے۔
 آپ کے مریدین کی خاصی تعداد جنوبی ہند میں پھیلی ہوئی ہے۔

۱۔ مصنف ”کلام جادو“ 335ء ۱۔ مصنف ”فوائد الاسلام“، ”شہادت نامہ“، ”رسول مقبول“ اور ”میزان
 المنطق“ ۳۔ ”جنان السیر“ پر موصوف کا مقدمہ موجود ہے جس سے اظہر کی بہترین نثری صلاحیتوں کا
 اندازہ ہوتا ہے۔ ۴۔ اپنے وقت کے جید عالم و فاضل تھے۔ ۵۔ مستان قطب دیور کے غائبانہ
 مرید تھے۔ اور اپنی تالیف ”گلشن رحمانی“ 892ء میں موصوف نے اپنے پیر و مرشد سید شاہ
 عبداللطیف قادری قطب دیور کا ذکر نہایت احترام و خلوص کے ساتھ کیا ہے۔

چار ہے ہیں۔ حالاں کہ آپ اپنے دور کے شعلہ بیان مقرر، معتبر مفسر، مستند محدث قابلِ فخر مورخ، صاحبِ طرز سوانح نگار اور مقبول ترین انشاء پرداز بھی تھے۔ آپ کی ادبی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو روشنی میں لانے کا شرف میسور کے ممتاز و منفرد محقق مولانا مولوی ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی صاحب کو حاصل ہے۔ آپ نے حضرت شاہ عبدالحی الحسینی لکھنوی (پیدائش 1671ء 1685ء وفات) مصنف ”نہتۃ الخواطر“ کے بارے میں نہایت وقیع اور پُر اُردو معلومات تحقیقاتی کام سرانجام دیا ہے۔ اُسی طرح شاہ عبدالحی احقر بنگوری پر بھی بڑی عرق ریزی جانفشانی اور ژرف نگاہی کا بین ثبوت فراہم کرتے ہوئے تحقیق اور تالیف کا بھرپور حق ادا کیا ہے۔ تاہم کوئی بھی تحقیق حرفِ آخر نہیں ہوتی، اس میں بہت کچھ اضافوں اور گنجائشوں کوئی راہیں ملتی رہتی ہیں اس لیے راقم الحروف نے بھی مولانا عبدالحی احقر (واعظ بنگوری) پر ایک تحقیقی نظر ڈالنے کی جسارت کی ہے۔

سلطنتِ خداداد کی تباہی کے بعد انگریزوں کا ظلم و ستم عروج پر پہنچا تو کئی معزز مسلم خاندان اس کی زد میں آئے۔ حضرت مولانا احقر بنگوری کے آبا و اجداد مغل شہنشاہ شاہ جہاں کے دور سے سلطنتِ خداداد تک بہت اہم اور اعلیٰ منصبوں پر فائز تھے۔ آپ کے والد ابراہیم بیگ ترکیرا (Terikira) کے عمل دار تھے۔ دادا گلان درگ کے آصف، پردادا قادر علی بیگ اعظم پور کے عملدار تھے۔ حضرت احقر کی والدہ کا سلسلہ نسب گڑھ بمقام پیاری بیگم بیٹ شہاں آرا کاٹ کے مشہور صوفی بزرگ شاہ آدم تک پہنچتا ہے۔ آپ کے والد زوالِ سلطنتِ خداداد کے بعد اپنے فوجی منصب سے

لے پیاری بیگم بیٹ اب پر نام بٹ کے نام سے منسوب ہے۔

معز دل ہو کر اپنے سسرال بنگلور آئے، جہاں حضرت احقر کی ولادت 1234ھ میں ہوئی۔ بچپن ہی سے آپ کا ماحول دینی اور علمی تھا۔ آپ نے اپنے والدین سے جہاں داد ہیاں کی بہادری، شجاعت اور جواں مردی کے سنہرے واقعات سنے وہاں نانیہال کے صوفیانہ رنگ ڈھنگ، تقویٰ اور پرنیہ کاری سے آگاہی حاصل کی۔ اس لیے عہدِ طفلی ہی سے آپ میں ہمت اور دلیری کے ساتھ علم و عرفان، نہد و تقویٰ، جذبہ دین داری اور حمیتِ اسلامی رچی بسی ہوئی تھی۔ چنانچہ آپ کی تمام تر تخلیقات میں اس کی نمایاں جھلک دکھائی دیتی ہے آپ کی ابتدائی تعلیم و تربیت گھر پر ہی ہوئی۔ بعد میں آپ بنگلور کے ایک مشہور عالم باعمل حضرت سید شاہ سجاد شطاری کے دامنِ تلمذ سے وابستہ ہوئے۔ موصوف کے دامنِ تربیت میں آپ کی شخصیت کے نقوش خوب نکھرے اور یہیں سے آپ کو علوم و فنون کا صحیح ذوق عطا ہوا۔ جب آپ نے بنگلور میں رہ کر علوم ظاہری سے فراغت حاصل کر لی تو اعلیٰ تعلیم کے لیے ویلور (ضلع شمالی آرکٹ) کا رخ کیا۔ اس دور میں ویلور میں حضرت سید شاہ محی الدین عبداللطیف قادری (المتوفی 1289ھ) کی ذاتِ اقدس علم و عرفان کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی، نشگانِ علوم و فنون کے لیے آپ کی خانقاہ چشمہ نورانی کی حیثیت رکھتی تھی۔ حضرت عبدالحی احقر بنگلوری جب حضرت قطب دیلور کے حلقہ ارادت سے وابستہ ہو گئے تو شیخ کامل قطب دیلور کی نگاہِ دور بین نے اس نوجوان، ہونہار اور قابل طالبِ علم کے باطن میں پوشیدہ جوہرِ نایاب کا سراغ لگایا اور احقر بنگلوری کا ذوقِ معرفت اور اشتیاق

لے حضرت عبدالحی کا نام ماں باپ نے "بڈھن بیگ" رکھا تھا۔ مگر قطب دیلور نے آپ کا نام عبدالحی تجویز کیا۔

وطلبِ راہِ حقیقت آہستہ آہستہ رنگِ لائی، جس کا اظہارِ بڑی والہانہ عقیدت کے ساتھ یوں کیا ہے یہ

خصوصاً شیخ میرا قطبِ اشہر یقین ایسے ہیں اخلاقِ جمیلہ
یقین اس عصر کا ہے شیخِ اکبر ہیں بے حد اس کے اوصافِ جمیلہ
سمجھ عبد اللطیف اس کا ہے نام ہے وہ فرزندِ سید ابوالحسن کا
لقب ہے محی الدین اے نیک انجام ہے پوتا محی الدین قطبِ من کا

(سرالشہادتین: مطبوعہ 1302ھ)

”جنان السیر“ کے دوسرے چین میں فرماتے ہیں :

خاص کر شیخ مراقبِ زماں شہرِ ویلور سے لے تا عرب
مستفیض ہیں اس ایک عالم اب ہر جگہ اُس کے فیوض و ارشاد
علمِ ظاہر میں ہے مدقِ فاضل عالم و حافظِ قرآنِ کریم
شک و الحاد کی توڑے بنیاد چرخِ عرفاں کا ہے بدرِ منیر
علمِ باطن میں محققِ کامل بالیقین جس کا مقدس سینہ
عارف و سالک و فرزانہ حکیم عارفِ عصر ہے ایسا ذی شان
ملک و جہان کا ہے شیخِ کبیر ہے حقائق کا عجب گنجینہ
خوشہ چیں جس کے ہیں عرفائے زماں اور حسنی ہے زسوائے مادر
محی الدین ہے مُلقب وہ ہمام ہے نسب میں وہ حسینِ زیدر
محی الدین قطبِ من جد اس کا یاصفا عبد اللطیف اس کا نام
بو الحسن والدِ امجد اُس کا

دیرِ گاہ اُس کو رکھے ربّ انا

مہتدی اُس کے مریدوں کو تمام

”چہار گلشن“ بھی مولانا کی اہم ترین تصنیف ہے۔ اس میں مولانا

نے اپنے شیخ کی مدح سرائی یوں کی ہے۔

شکر اللہ دریں زمانِ آخیر
شیخ الشیخ سببِ السادات
مجمع سیرتِ حسینؑ و حسنؑ
علم ظاہر میں فارغ التحصیل
جامع علم ظاہر و باطن
ہے شریعت میں عالم و عامل
قبر و بلور سے جو ہے مشہور
ایک عالم مرید ہیں اس کے
معتقد اس کے ہیں خواص و عوام
موشگافی ہے اس کو عرفاں میں
سر و ظاہر میں ہے غرض یکتا
ہے حمایت میں دین کے سر و عیاں
زہد و تقویٰ میں اور توکل میں
حق نے بخشا ہے اس کو شانِ جلیل
ذکرِ مولا میں صبح سے تا شام
دائماً اس کی محفلِ پر نور
جب ملک بیٹھیں اس کی محفل میں
ذکرِ مولا سے دل کو اُنست ہو
پیشتر اس کی محفلِ انور !

فرد ایسا ہے ایک میرا پیر
ذوالکمالات منبعِ برکات
خلف بوالحسن شہید امن
علم باطن میں صاحبِ تکمیل
معدنِ فیض یا رزد کا من
اور طریقت میں واصل موصول
ذات اس کی ہے ایک منبعِ نور
علم باطن اسی سے ہیں سیکھے
کیا امیر و فقیر یا اکرام
نکتہ یابی کمال و جہاں میں
پیشوا ہے وہ دین و ملت کا
محمی الدین ہے اُسے لقبِ ثنایاں
مُجود و بخشش میں اور تبذل میں
کوی اس عصر میں نہ اس کا عدیل
ہے اُسے اطمینان اور آرام
ذکرِ مولا سے ہے یقین معمور
خوفِ حق تب تک رہے دل میں
اُنست و حُب اور لذت ہو
ذکرِ دنیا سے دُور ہے اشہر

اس کی محفل ہے مور درِ رحمت اس کی صحبت ہے دافعِ غفلت
 اس کی مجلس دلا دے یادِ خدا اس کی صحبت دکھا دے راہِ خدا
 اس کی صحبت ہے کیمیا تاثر زر کرے مس کو پل میں بے تاخیر
 یا الہی اُسے سلامت رکھ !
 اُس کو فیاضِ تاقیامت رکھ

اقطابِ دیور کے فیوض و برکات سے متعلق فرماتے ہیں :
 جو دتِ طبع تھی اس کی رسا اور تھا نیز اس کا فہم و ذکا
 ہوا مائل مطالعہ کی طفسر تھوڑی مدت میں ہی وہ کانِ شرف
 عربی معتبر کتب پہ تمام ہوا حاوی بفضلِ ربِّ انام
 سب پہ قادر کیا اُسے قادر ہوا ہر فن میں وہ بڑا ماہر
 اور تصوف کے سب رموزِ دقیق اپنے والد سے کر چکا تحقیق !
 ہوا یکتا دلیل و برہاں میں اور کشف و شہود و عرفاں میں
 اس کا کوئی سمجھ عدیل نہ تھا کوئی اس ملک میں مثیل نہ تھا
 بس اسی فن میں وہ گرامی تھا ثانی جامی و نظامی تھا

یہ نہیں ہے مبالغہ اے یار

واقعی ہے یہ بات بے تکرار

مولانا اشقر بنگوری بہ فیضِ قطبِ دیور نہ صرف اپنے دور کے عالمِ با عملِ صوفیؒ با صفا بنے بلکہ دل گداز شاعر اور اصلاح پسند ادیب کی حیثیت سے آفاق گیر شہرتوں اور نیک نامی سے سرفراز ہوئے۔ آپ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی منظوم سیرت ”جنان السیر“ (جو دس باب میں منقسم ہے) تحریر فرمائی جسے دیر ۲۵ سال سے آج تک جنوبی ہند بالخصوص کرناٹک اور مدراس

کی اکثر خواتین گھروں اور مجلسوں میں ہر جمعرات بعد نمازِ مغرب پڑھتی ہیں۔
 بے نظیرِ مثنوی (جوارِ دوزبان میں مثنوی مولانا روم کا نعم البدل ہے) یہ نظم
 بابیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ آپ صحیح بخاری شریف کی شرح "فیض الباری"
 (1292ھ) کے نام سے لکھی جو دس جلدوں پر محیط ہے۔ یہ کتاب بخاری شریف
 کی سب سے پہلی اردو شرح ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ مولانا احقر کی جو کتابیں
 عالم شہود پر آئیں، اُن میں درج ذیل اہمیت رکھتی ہیں۔

- ۱۔ خطباتِ حریمین۔ جمعہ کے خطبات کا پہلا مجموعہ ہے جو اردو میں شائع ہوا۔
- ۲۔ تفسیر الجواہر :- مولانا کی منظوم تفسیر ہے۔
- ۳۔ حدیقۃ الاجاب :- خلفائے راشدین کے حالات پر ایک ضخیم اور مبسوط نثری
 کتاب ہے۔
- ۴۔ شرح سیر الشہادتین :- حضرت امام حسینؑ کی سیرت پر ایک طویل نظم ہے مطبوعہ
 1302ھ۔

- ۵۔ خلاصۃ السیر :- اسلامی تاریخ کا خلاصہ ہے
- ۶۔ روضۃ الابرار :- اہل بیت کی سیرت و تاریخ پر مشتمل ہے۔
- ۷۔ تحفۃ مرغوب :- حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے تعلق سے بڑی معلومات
 افزا کتاب۔

- ۸۔ تذکرۃ المجتہدین :- ائمہ فقہ کے حالات پر مبنی کتاب۔
- ۹۔ ریاض الانہر :- سیرتِ طیبہ پر یہ دوسرا ضخیم مجموعہ ہے جس میں سات

۱۰۔ مولانا احقر بنگلوری اپنے خطبات کی مقبولیت کی بدولت حضرت واعظ بنگلوری کے نام سے بھی
 بڑی آفاقی شہرتوں کے مالک تھے۔ مطبوعہ خطبات کی اولیت کا سہرا بھی موصوف کے سر ہے۔

نہزار سے زیادہ ابیات موجود ہیں۔

۱۰۔ نصرۃ التوحید :- وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود پر تفصیلی بحث اس کتاب میں شامل ہے۔ مطبوعہ ۱۳۲۵ھ

۱۱۔ حقوق الزوجین :- معاشرے کے حالات پر یہ ایک وقیع اور جان دار نشری کتاب ہے۔

۱۲۔ منہج النبوت :- اہمیت نبوت اور اسرار نبوت پر اس کتاب میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۳۔ فوائد قدسیہ :- یہ کتاب سید الاولیاء کی منقبت اور سوانح پر مشتمل ہے۔

۱۴۔ مطلع الانوار :- مطبوعہ ۱۲۹۰ھ اور

۱۵۔ کلید معرفت :- مطبوعہ ۱۳۰۰ھ۔

مندرجہ بالا کتابوں کے علاوہ حضرت احقر بنگوری نے اپنے دور کے رجحان، بدعت اور خرافات کی رد میں اور بھی بہت ساری معرکتہ الآراء کتابیں تصنیف کیں جس سے ایک طرف اردو زبان و ادب کا بھلا ہوا تو دوسری طرف مسلم قوم و ملت کی خاطر خواہ اصلاح بھی ہوئی۔ کزنائک سے ہٹ کر بہت پہلے یہی مبارک کام اپنی شعری تخلیقات کے ذریعہ آندھرا پردیش میں حضرت مولانا شہید شاہ رحمۃ اللہ نائب رسول (آستانہ مبارک رحمت آباد) اور شہرہ راس میں حضرت مولانا باقر آگاہ دیوری اور نشری قاضی بدرالدولہ نے انجام دیا تھا۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ مولانا مولوی ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی صاحب کے قول کے مطابق آپ کے تصانیف کی تعداد ایک سو سے زیادہ ہے۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ تحقیق پر کوئی چیز حرفِ آخر نہیں ہوتی اس لیے قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ یقیناً انہیں کہ اردو ادب اور اسلامیات کی تاریخ میں آج تک

کسی شاعر، ادیب، نقاد، عالم، مفسر کی اتنی کتابیں منظرِ عام پر جلوہ خور نہیں ہوئی ہوں گی جو معیار کے اعتبار سے بھی اعلیٰ وارفع اور مواد کے اعتبار سے بھی ہر دور کے انسان کے لیے سودمند ثابت ہوں۔ سرزمینِ کرناٹک کی یہ خوش نصیبی ہے کہ حضرت مولانا عبدالحی احقر بنگلوری کو اس نے جنم دے کر اپنی مانگ میں نورانی اور آن مٹ سیندر بھر لیا ہے جس کو وقت کی آندھیاں تو کیا کسی تنہا۔ نقاد کی سازشیں بھی مٹا نہیں سکتیں۔

حضرت مولانا احقر بنگلوری بنیادی طور پر ایک اسلامی شاعر تھے۔ علامہ محمد اقبالؒ کی طرح آپ کی شاعری اصلاحی اور نیک مقصدیت سے مملو تھی اردو نثر سے زیادہ اقبالؒ کی طرح آپ کا بھی طبعی میلان نظم کی طرف تھا۔ اقبالؒ کی نظموں کی طرح مولانا احقر کی نظموں میں بھی سلاست، روانی اور اسرار و رموز کی وہ تمام تر جلوہ سامانیاں موجود ہیں، جو اقبالؒ کی شاعری کا نکتہٴ عروج سمجھی جاتی ہیں۔ اردو ادب میں مولانا نے موصوف کی بلند خیالی، احساس و جذبے کی آئینہ گری، فکر و فن کی آفاقیت ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

من حیث المجموع مولانا احقر بنگلوری کی ذاتِ گرامی کی بدولت جہاں علمی، دینی اور اصلاحی تحریروں کی کرنیں آسمانِ فکر و فن منور ہوئے وہاں دکنی اردو کو بھی خاطر خواہ تقویت اور فروغ نصیب ہوا۔ مولانا احقر کی ان احسن خدمات کو اردو ادب کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی

۳ رجب 1300ھ کو مولانا کعبۃ اللہؒ کی زیارت کے لیے دوا نہ ہوئے اور موصوف کے حب رسولؐ اور عشق نبویؐ کا کیا کہنا کہ وہ کرناٹک دویارہ واپس آ سکے۔ وہیں مدینہ منورہ میں تدفین عمل میں آئی۔ ۹۰۔



پروفیسر غلام حسین دلیل مدوری اور نظم "کائنات"

سلطان علاء الدین خلجی کے نام ور سپہ سالار ملک کافور نے 709ھ
1309ء میں کرناٹک اور 710ھ 1310ء میں انتہائی جنوب کے علاقوں
رامیشورم، کاریکال ناگور اور مدوری فتح کیا اور اس کے ساتھ ہی شمال سے
علمائے دین اور صوفیائے کرام نے بھی دکن کی سرزمین کا رخ کیا۔ 748ھ 1347ء
میں امیرانِ صددہ سے ایک امیر علاؤ الدین کو دکن کا بادشاہ منتخب کیا۔ تو اس
کا دارالخلافہ کلبرگہ بنا۔ بہمنی دور (1350ء تا 525ھ) کے بعد عادل شاہی
(1490ء تا 1685ء) قطب شاہی (1518ء تا 1686ء) اور نظام شاہی
(ادوار میں فارسی زبان کے اثرات آہستہ آہستہ دم توڑ کر

دکنی زبان کے اثرات بڑی سرعت اور توانائی کے ساتھ وسعت و کشادگی پانے لگے۔ اس زبان کی خوش فطرتی ہے کہ اس سے شاہی اور خانقاہی سرپرستی حاصل رہنے کی وجہ سے زمین بزمین، منزل بہ منزل ارتقائی سر بلندی میسر ہوئی۔ شمالی ہند کی زبان اردو نے معلیٰ اور جنوبی ہند کی دکنی زبان میں سب سے زیادہ فرق یہی تھا کہ اردو نے معلیٰ فارسی زبان کے اثرات کے زیر سایہ پردان چڑھتی رہی تو دکنی زبان ہندی کے رنگ و آہنگ اور ہندی مزاج کو بحال رکھتے ہوئے اور مقامی زبانوں کے اثرات قبول کرتے ہوئے جنوبی ہند کے آخری کنارے اس کماری تک کثرت سے بولی جانے لگی۔

ملک کافور کے حملے سے برسوں پہلے ہی سے ہند کے ساحلی مقامات کارومندل اور ملیبار پر مالک دینار کی تعمیر کردہ مساجد اور "وحدۃ لائبریک" کی مقدس صدائوں سے یہاں کی فضائیں منور و معطر تھیں۔ لہ اس دور میں قرآن و حدیث، فقہ اور دیگر علوم و فنون پر زیادہ توجہ دی گئی اور ہر مقام پر قاضی و معلم مقرر کئے گئے۔ عرب تاجر اور مبلغین دین کی وجہ سے یہاں کی فضا لازوال روحانی اثرات سے معمور تھی۔ جس کی شہادتیں ابن بطوطہ کے سفر نامے میں بھی موجود ہیں اور بقول فرشتہ محمد بن قاسم کی فتح سندھ سے پہلے ہی ملیبار میں سکونت پذیر تھے۔

ملک کافور کے بعد معبر کے صوبہ دار سید جلال الدین احسن شاہ (جواہر ناطہ سے تھے) نے پانچ سال (1338ء تا 1335ء) دوری پر خود مختار حکومت کی۔

بقیہ صفحہ کا حاشیہ :- خواجہ گیسو دراز دہلی سے (854ھ تا 1412ء) کلبرگہ آئے۔ آپ حضرت شیخ نصیر الدین جریغ دہلوی کے مرید و خلیفہ تھے۔
لے یورپ میں دکنی مخطوطات : ص : 421 : مولوی نصیر الدین ہاشمی۔

ملک کافر کے ساتھ شمال سے آنے والی شاہی فوج کے بعض عائدین نے احسن شاہ کی حکومت کو اپنے مزاج اور فکر کے مطابق پاکر مدوری ہی کو اپنا مستقل مسکن بنایا۔ احسن شاہ کے بعد علاؤ الدین سکندر شاہ ولی ، (آخری مسلمان بادشاہ) نے مدوری پر چھ سال (373ھ تا 372ھ) تک بادشاہت کی اور یہیں تروپارن کنڈرم نامی پہاڑی پر جام شہادت نوش کیا۔ مدوری میں بسنے والے انہی زعماء میں سے حضرت غلام حسین دلیل کے آباء و اجداد تھے۔ حضرت دلیل 16 مارچ 1895ء کو شہر مدورے میں قاضی محلے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حضرت محمد ابراہیم ذراچ تجارت پیشہ ہونے کے باوجود فطرتاً صوفی مزاج آدمی تھے۔ آپ پر ہمیشہ ایک محویت کا عالم طاری رہتا تھا۔ مدورے میں آپ کے عقیدت مندوں کی کثیر تعداد تھی۔ آپ ملک التجار ہونے کے ساتھ ساتھ فنونِ حرب کے بھی ماہر تھے۔ مدورے عوام میں بھی آپ "ذراچ مستان" کے نام سے مشہور تھے۔ آپ کے اجداد کی طرح ننھیالی سلسلے کے افراد بھی ساداتِ کبار (مغزین شیراز دایران) سے تعلق رکھتے تھے۔

اسی سلسلہ کے ایک بزرگ حضرت سید شاہ جمال الدین شاہ منگول کے وزیر تھے۔ سید جمال الدین کے جدِ امجد سید شاہ جمال الدین کے دستِ حق پرست

۱۔ اسی پہاڑی پر آپ کا مزار مبارک واقع ہے۔

۲۔ حضرت مولانا عبد الوہاب (المتوفی 337ھ) بانیِ باقیاتِ حیات کا سلسلہ نسب بھی انہیں رنگا دی وقارِ شیوخِ طریقت سے ہے اس تو ضیح و تشریح سے یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ مولانا عبد الوہاب کے حب و نسب سے متعلق بعض اہل قلم حضرات کو اشتباہ یا تاریخی مغالطہ ہوا ہے کہ درجن کے بیان کو عمر ماہل تصنیف نے بغیر کوئی ملائش و محصص کے نقل کر دیا ہے۔

شاہ منگول غازی خان نے اسلام قبول کیا تھا۔ یہ عالم اسلام کا انتہائی اہم واقعہ تھا۔

کشاکش حالات اور وقت کی ستم ظریفی سے تنگ آکر شاہ جمال ثانی اپنے وطن غزنیکو خیر باد کہہ کر ہندوستان آئے اور ملیبار میں بودو باش اختیار کی۔ یہاں آپ قاضی القضاات مقرر کئے گئے۔ شاہ جمال کے فرزند سید شاہ تاج الدین کو سلطان علاء الدین نے قاضی العسکر کے عہدے سے سرفراز کیا۔ حضرت تاج الدین کے خاندان کے اردو اور فارسی اور عربی ادب کی ان مول اور نایاب کتابیں آج بھی مدراس کی اور سینٹل لائبریری میں محفوظ ہیں۔ ان کتابوں کے ذخیرہ سے اتنی بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ علمی ادبی اور تاریخی تصانیف اور تالیفات کا دور بہت شاں دار اور وسیع رہا۔ بہر حال حضرت دلیل کے دونوں معزز سلسلوں میں علوم و مناصب کا تسلسل باقی رہا۔ مدوری کے ماحول میں حضرت دلیل کا خاندان السنہ شرقیہ میں ماہر و کامل سمجھا جاتا تھا۔ مدورے ٹمل زبان کا مرکز ہونے کے باوجود وہاں کے قاضی محلے میں فارسی اور دکنی زبان عام تھی۔ دلیل نے اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم گھریہ حاصل کی اس کے بعد امریکن ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ گھریو حالات کی ناہمواری کی وجہ سے آپ نے

شمالی ہند میں بنارس اور متھرا کو جو عظمت حاصل ہے وہی عظمت اور شان و شوکت جنوب میں مدوری دجو دراوڑی تہذیب و تمدن کا دیرینہ اور مقدس مقام ہے۔ یہ کو حاصل ہے۔

لے اس محلے کی عورتیں فارسی اور دکنی زبان میں بآسانی گفتگو کر لیتی تھیں۔

سلسلہ تعلیم ترک کر کے سرکاری ملازمت اختیار کی۔ چوں کہ آپ کی طبیعت علم و ادب کی طرف زیادہ مائل تھی اس لیے آپ نے Collectorate کی ملازمت سے سبکدوشی اختیار کر کے مقامی اسکول میں بطور اردو منشی درس و تدریس کی ذمہ داری قبول کر لی۔ اسی اسکول سے ترقی پا کر موصوف نے امریکن کالج مدورہ میں اردو لکچرار کے منصب پر فائز ہوئے۔ آپ کا میلان طبع صغریٰ ہی سے شعر و شاعری کی طرف رہنے کی وجہ سے تعلیمی و تدریسی مشاغل سے ہٹ کر آپ نے علم و ادب کی بہت زیادہ خدمات انجام دیں۔ شعر و ادب کے ساتھ ساتھ موسیقی، شہ سواری

پہلوانی اور سیر و سیاحت میں بھی آپ نے اپنی طبعی ہنرمندی کے نمایاں نقوش چھوڑے ہیں۔ (باوثوق شہادتوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حضرت جمیل نے چند ڈرامے بھی مدراس کے ذی وقار ماحول میں اسٹیج کئے تھے جن کی موسیقی خود آپ کے فزند قیصر حسین نے ترتیب دی تھی)۔ گویا حضرت دلیل کو علم و ادب اور فنون لطیفہ کا ذوق قدرتی طور پر عطا ہوا تھا۔ ایک طرف مسائل تصوف اور عرفان و آگہی سے گہرا لگاؤ اور دوسری طرف فنون لطیفہ سے والہانہ وابستگی کے متضاد رجحانات کی منزوجیت بڑی

اے حضرت دلیل مرحوم کے چھوٹے بھائی جمیل ٹل ناڈو کے مشہور و معروف ڈرامہ نویس ہیں۔ موصوف کے کئی مختصر ڈرامے ’مرا کیا نہ کرتا‘، ’ایک رات‘ اور کسی کو کیا خبر‘، ’ماہ نامہ فصاحت‘ حیدرآباد میں 1942ء اور 1943ء میں زیر طبع سے آ رہے ہو چکے ہیں اور بہت سارے ڈرامے مثلاً ’سیر شہزادی‘، ’غریبوں‘، ’نادید‘ اور ’آرہ‘ مدراس میں اسٹیج بھی کئے گئے۔ اردو ڈرامہ کے فن میں جتنی وسعت اور کشادگی جمیل اور ان کے بھائی قتیل نے دی وہ واقعی ناقابل فراموش کا زمامہ ہے۔

تعجب خیز بات سہی مگر دلیل کی خداداد صلاحیتوں اور جودت طبع کی آئینہ دار تھی۔

۱۹۵۲ء میں حضرت دلیل امریکن کالج سے ریٹائر ہو کر مدراس آئے اور یہیں آپ نے مستقل سکونت اختیار کر لی۔ قیام مدراس کے دوران آپ نے کچھ دنوں کے لیے نیو کالج، مدراس میں اردو لکچرار کے فرائض انجام دئے۔ اس عہدے سے عہدہ برآ ہونے کے ڈیڑھ سال بعد مسلسل علالت کا شکار رہ کر ۱۲ اگست ۱۹۵۷ء / ۱۳۶۸ھ) ترسٹھ سال کی عمر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس دار فانی کو خیر باد کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تعجب اس بات کا ہے کہ مرتے دم تک حضرت دلیل کی سانسوں کی زبان پر صوفیوں اور درویشوں کا دیا ہوا وظیفہ "انڈلس باقی ہوس" جاری تھا۔ یہ یقیناً حضرت دلیل کی قلندرانہ اور فقیرانہ عظمت و شان کی روشن دلیل ہے۔

حضرت دلیل بڑے مخلص اور ملنسار تھے۔ طبیعت میں عجز و انکساری اور شخصیت میں بڑی محبوبیت تھی۔ آپ بلند اخلاق، نفاست پسند اور عقل و دانائی کا منبع تھے۔ سچائی، سادگی، ہمدردی، زہد و تقویٰ قناعت و توکل اور صوم و صلوٰۃ کی پابندی کے پر نور جوہر سے آپ کی ذات و صفات معطر و منور تھی۔

علم و روحانیت اور شعر و ادب کا وہ چراغ جسے دنیا حضرت دلیل کے نام سے جانتی اور پہچانتی تھی اور جس کے فکری اجالوں کی ٹھنڈک سے ساری کائنات سرسبز و شاداب تھی وہ عہد آفریں شخصیت نام نہاد حصولِ شہرت اور دنیاوی طمع سے دور بہت دور اور عشقِ الہی میں جو جوق تھی۔ حضرت دلیل شعری دنیا کے بے تاج شہنشاہ ہیں جن کی طویل

نظم کائنات، بڑی معرکہ آلا اور تخلیق ہے۔ اس نظم میں موصوف نے اپنے مشاہدات، تجربات، تفکرات اور معلومات کا پچوڑ پیش کیا ہے۔ یہ طویل نظم گویا زبان و بیان کی پاکیزگی، تخیل کی بلند پروازی، مشاہدے اور تجربے اور تجزیے کی گونا گوں خصوصیت کی بھرپور عکاس ہے۔

زندگی پیغمبرِ کامل کی اور اہم الکتاب رہنمائی۔ یہ کافی ہے تا یوم الحساب
دیکھ اس کو جو زمیں و آسمان کا نور ہے دیکھے والوں کو دنیا جلوہ گاہ طور ہے
نظم کائنات، بقولِ حضرت دلیل بعض قرآنی آیات، اور احادیثِ نبویؐ کا خلاصہ سہی مگر ناچیز کی رائے میں یہ طویل نظم فلسفیانہ نکات، اسرار و تصوف، رموزِ عرفانِ ذات و کائنات اور عشق و معرفتِ الہی کے اشارات و کنایات کا سرچشمہ بھی ہے۔

دولتِ عشقِ الہی سے جو دل آباد ہیں خوف و غم، یاس و ہوس کی زد سے وہ آزلوں میں
وصلِ حق تکمیلِ نفس و انتہائے ہوش ہے بے خودی اس ہوش کا یک جلوہ خاموش ہے
اس طویل نظم کے مطالعہ سے نہ صرف حضرت دلیل کی ذہنی اُچک، علمی پس منظر اور تعمقِ نظری کے روشن خط و خال نمایاں ہوتے ہیں بلکہ قاری کے آگے اسلامی عقائد، ایمانی خوش بو اور روحانی تجلیات کے دریچے بھی وا ہو جاتے ہیں۔ اور پھر ان دریچوں سے چھنتی ہوئی خنک کرنوں سے

انسانی احساس و جذبہ آسودہ ہو جاتا ہے۔ حضرت دلیل کے اسلامی عقیدے کی ایک جھلک موصوف کے شعری آئینہ میں ملاحظہ فرمائیے :

حرکتِ ازلی پہ قائم ہے نظامِ کائنات نغمہ سوزِ عمل ہے نغمہ سازِ حیات
انہماکِ جاوداں ہے زندگی کا ثبات ہے سکونِ سامان جو بھی موت ہے اس کی بات
نوعِ انسان کو خدا کی دین جو اسلام ہے حسنِ ایمان و عمل کا سرمدی پیغام ہے

حضرتِ دلیل نے زندگی کے مختلف النوع پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے نیکی اور بدی سے متعلق ایک آن مٹ سچائی ہمارے سامنے دکھ دی ہے جسے وہ نیکی جس سے حاصل ہو کمالِ زندگی

وہ بدی ہے جس میں پنہاں ہے زوالِ زندگی

”کائنات“ سے متعلق حضرتِ دلیل کا نقطہ نظر یہی اور

روحانی رشتوں کا پاس دار ہے۔ صراحہ روایاتی قدروں کا مرہونِ منت ہے یہی وجہ ہے کہ وہ فرماتے ہیں : ۵

زندہ جاوید حق کی سرمدی ہیں کل صفات

نغمہ ہائے کُن سے ہے معمورِ نریم کائنات

حضرتِ دلیل نے زندگی اور کائنات کے تجزیے اور اس کے

نتیجے کے استنباط میں بڑی ژرف نگاہی، مفکرانہ استعداد اور شاعرانہ خلاقیت سے کام لیا ہے۔ اور تخلیقِ کائنات کے رموز سے آگاہی حاصل کرتے ہوئے کہا ہے کہ : ۵

ہے صفاتِ رب کا جلوہ یہ ظہورِ کائنات

یا مشیت میں نہاں تھے یا عیاں ہیں ممکنات

نظمِ کائنات کے غائر مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت

دلیل علامہ اقبال کے لہجے سے زیادہ متاثر ہیں۔ اور علامہ اقبال ہی کی طرح موصوف نے اپنی شاعری کے توسط سے ایک عالم کو نہ سہی ایک دور کو ضرور متاثر کیا ہے۔

اس نظم کے روشن خدو خال، صراحہ اور پاکیزہ احساسات اور

جذبات کی زیریں لہروں سے آشنا ہونے کے بعد اتنی بات وثوق سے

کہی جاسکتی ہے۔ کہ حضرت دلیل کا مقصد تخلیقِ نظم حیاتِ انسانی کی پاکیزہ اور اعلیٰ قدروں کی حفاظت اور اس کی تعمیر و تکمیل کے ساتھ ساتھ انسان کے اخلاق و کردار کی گرتی ہوئی دیواروں کا بچاؤ بھی ہے : ۵

عقل و قدرت لاکھ ہو، تکمیلِ اخلاقِ بشر

ہو اسدا پابندی احکامِ رب پر منحصر

خالقِ نظم کا نسات نے شاعری کے تعلق سے کہا ہے کہ : ۵

شاعری سوزِ حیات و ندرت و تخلیق ہے

فلسفہ فکر و نظر ہے، بحث ہے تحقیق ہے

ہمارے یہاں آج کل نہ اردو شاعری کی قدر ہے نہ قیمت اور نہ

ہی اس فنِ شریف کے بھی خواہ آج سے تقریباً دیرھ سو سال پہلے

حضرت سید صادق الحسینی شریف مدراسی (المتوفی ۱۳۲۲ھ) نے

بھی اپنے دور کی نا قدریٰ اربابِ ہنر کا رونار دتے ہوئے کہا تھا۔ ۵

مدراس سانا قدر کوئی شہر نہیں

میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی صاحبِ علم و دانش اور خروانِ مملکت شعر

ادب حضرت دلیل سی طویل نظم "کائنات" اور ان کے ہم عصر با حالیہ دور میں

لکھی ہوئی طویل نظموں مثلاً حضرت امانی بلی کندوی (۱۳۸۶ھ)

۱۰ نظموں غزلوں اور قطعات کا مجموعہ "نغمہ درویش" مطبوعہ اعجاز پریس

حیدر آباد

۱۱ مصنف "حدیث شریف" اس شعری مجموعہ کی اشاعت کے بعد اس وقت

کے قاضی شہر نے شریف مدراسی کو کفر کا فتویٰ دیا تھا۔

”کی کلشن سیرت“، حضرت دانش فرازی کی ”نالہ فرات“ اور ”محسن اعظم“، کاوش بدری کی ”کادیم“۔ مولانا حافظ باقوی کی ”قمر نامہ اسلام“ اور حسن فیاض کی ”مدح ساقی کوثر“ کو حرمت الاکرام کی ”کلکتہ ایک رباب“ جوش ملیح آبادی کی ”طلوع فکر“ عمیق حنفی کی ”سندباد“ اور ”سلسلہ الجرس“ اختر الایمان کی ”یادیں“ اور کمار پاشمی کی ”ولاس یا ترا“ کے تناظر میں دیکھئے گا تو یقیناً وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ تامل ناڈو کے فن کاروں کی بطول نظمیں بھی موضوع اور معیار و افادیت کے اعتبار سے اردو ادب کے شعری کارناموں میں نہ صرف اضافہ کی حیثیت رکھیں گے بلکہ علوم و فنون کی تجلیات میں ہمہ گیر اہمیت کا باعث بنیں گے۔

حضرت دلیل نے جہاں ”بیروانہ“ ”صوفی“ ”بلبل“ ”انسان“ ”کشمیر“ ”ہمالہ اور“ ”راس کمار“ جیسی موضوعاتی نظمیں لکھیں اُن وہیں زمانہ کے چلن کے مطابق غزلیں اور قطعات بھی لکھے ہیں۔ ان کی تمام تر نظمیں منظر کشی، جذبات نگاری اور محاکاتی انداز سے مملو ہی نہیں بلکہ نظیر اکبر آبادی کی نظموں کی طرح جذب و کشش کی شان و شوکت، احساس کی بوقلمونی اور خیال آفرینی کی ہبک سے لیس ہیں۔

برحیثیت مجموعی حضرت دلیل کی شاعری میں مضمون آفرینی اور تہ داری کے علاوہ زبان و بیان کی حلاوت، فکر و اظہار کی جلوہ گری، سلاست و روانی کی دل کشی اپنی ارتقائی صوفشانیوں کے ساتھ موجود ہیں جو ایک فن کار کو اردو ادب کی تاریخ میں نمایاں مقام عطا کرتی ہیں۔

۱۹۶۵ء
مطبوعہ ”ادبی اڈیشن“ پٹنہ
پٹنہ (بھارت)

علا نظموں غزلوں قطعات کا مجموعہ ”نغمہ درویش“ مطبوعہ اعجاز پریس حیدرآباد ۱۹۶۵ء



علامہ قدوسی باقوی کا فکری سفرنامہ

عادل شاہی سلطنت کے زوال کے بعد بیجاپور کے اکثر اہل علم و فضل اور صوفیائے کرام نے کمرناٹک کا رخ کیا اور اس کے پایہ تخت آراکٹ اور اس کے مضافات بالخصوص ویلور میں مستقل سکونت اختیار کی۔ ویلور کی سرزمین اتنی نہرخیں اور خوش گوار تھی کہ ان علماء و شعراء نے اس زمین سے اپنا لوٹ رشتہ جوڑ کر اس کی مٹی سے وہ نورانی کرنیں چار سو پھیلائیں کہ اس زمین کی مہکتی ہوئی فضا میں روحانی جلوہ گاہ کے ساتھ ساتھ علم و ادب کی آماجگاہ بھی بن گئیں۔ اس سلسلے کی چند کرنوں میں میر ولی فیاض ولی ویلوری سید شاہ ابوالحسن قرظی ویلوری، سید شاہ عبداللطیف قادری ذوقی، محمد باقر آگاہ ویلوری، عبدالقدوس صوفی ویلوری، منور نظر آتے ہیں۔ انہیں منور کرنوں سے مولانا عبدالسلام کمالی ویلوری، مولانا جعفر حسین فیضی صدیقی ویلور بدر الحسن بدرجمالی ویلوری اور مولانا نثار احمد قدوسی باقوی بھی اپنے فکر و فن کا

رشتہ استوار کئے ہوئے ہیں۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ ہم شخصیات کی عصبیت کے اتھاہ دلدل میں پھنسے ان فن کاروں کی تخلیقی صلاحیتوں سے اس طرح اغماض برت رہے ہیں جیسے یہ فن کار ہمارے درمیان ہوتے ہوئے بھی موجود نہیں ہیں حالانکہ ان فن کاروں سے استفادہ کرنے والوں کا حلقہ بھی وسیع سے وسیع تر ہے۔ پتہ نہیں یہ علمی اور ادبی احسان فراموشی اور عصبیت کے جراثیم کب تک اور کہاں تک انسانی لہو میں چکر کاٹتے رہیں گے۔ آخر کار کوئی تو اس کا تدارک اور مجرب علاج ہو۔ ورنہ زندگی اور فن کا درمیانی رشتہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دم توڑ کر رہ جائیں گے اور اردو ادب میں دوردور تک زندگی کے عطا کردہ احساس جذبہ، اظہار اور فکر و فن کی لاشیں رہ جائیں گی جن سے نہ کوئی شخصیت ابھرے گی اور نہ کوئی آواز۔

حضرت مولانا نثار احمد فدوی باقوی 1928ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد نیرنگوار مولانا مولوی حبیب اللہ ندوی باقوی اپنے وقت کے جمید عالم، ماہر لسانیات، مفتی و فقیہ اور کئی علمی و دینی کتابوں کے مصنف تھے۔ مولانا فدوی باقوی نے عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم باقیات الصالحات عربک کالج سے حاصل کی۔ 1945ء سے 1953ء تک تجارت کے سلسلہ میں کیرلا (تروم) گئے اور اس کے بعد دوبارہ 1953ء کے اواخر میں باقیات ویلور لوٹ آئے۔ اور یہیں ناظم کتب خانہ کے عہدے پر فائز ہو گئے اور آج بھی اسی عربک کالج میں منتظم کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

مولانا فدوی باقوی کا شمار تامل ناڈو کے اُن اربابِ علم و فن میں ہوتا ہے جنہوں نے تامل ناڈو کے ادبی ماحول کو خاص توجہ اور بصیرت کے ساتھ نیا رنگ و نیا آہنگ بخشا۔ آپ فن پر بڑی اچھی دسترس رکھتے

ہیں۔ آپ کا مطالعہ وسیع ہے۔ فکر بلند اور عزائمِ راسخ۔ آپ کی شاعری کا ہجہ قدیم ہونے کے باوجود تنوع، جدت اور سحر طرازی کا حامل ہے۔ نثر اور نظم دونوں پر عبور حاصل ہے۔ آپ کی تخلیقات میں اگرچہ عصری آگہی اور جدید حسیت کے عناصر بہت کم پائے جاتے ہیں۔ لیکن آپ نے جن نوجوانوں شعراء کی ذہنی، ادبی اور علمی تربیت کی ہے ان کے ہجے کا تیکھا پن جدیدیت سے لبریز ہے۔

یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہ آ سکی کہ مولانا فدوی نے کیوں ہمیشہ اپنی جامع الکمال شخصیت اور جامع الصفات ذات کو گلاب کی مہین پنکھڑیوں میں پوشیدہ رکھا۔ نہ جانے اس گوشہ نشینی میں کیا راز پنہاں ہے اور اس راز کے پیچھے نہ جانے وہ کون سی تمنا جلوہ گر ہے جس کے نظارے کے لیے ایک کائنات منتظر ہے۔ مولانا فدوی کو اس گوشہ نشینی سے باہر نکالنے کا قصور کچھ تو ہمارے اُبھرتے ہوئے تنقید نگاروں پر ہے اور کچھ ان کے اپنے قریبی دوست و احباب پر بھی، جو اچھے شاعر ہی نہیں بلکہ اچھے نثر نگار بھی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اُن کے قریبی دوستوں نے ان کے وجود میں چھپی ہوئی علمی و فکری ہمہ جہت شخصیت کو ڈھونڈ نکالنے اور اسے منصفہ شہود پر لانے کی کوشش ہی نہیں کی۔

اور اپنا فریضہ بھی نہیں سمجھا، بلکہ ان کے متعلق دوستانہ محبت سے سوچنے اور سمجھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ پتہ نہیں ہمارا آئندہ مورخ اور ادبی تاریخ اس دوستانہ ادبی دشمنی کو کس نام سے یاد کرے گی۔

مولانا فدوی کا ادبی سفر جہاں سے شروع ہوتا ہے وہاں ہمارے اُس پاس کے سانس لیتے ہوئے شاعر و ادیب کا سفر اپنی تھکی تھکی ہوئی

سانسوں کے ساتھ اپنا دم توڑ دیتا ہے۔ گویا میں بہ کہوں تو بے جان ہوگا کہ مولانا فدوی جس منزل کی طرف گامزن ہیں اس منزل کی راہیں ان کی تلاش و جستجو کی آنکھوں کو ایک نئی روشنی اور توانائی عطا کرتی ہیں۔ اور ان کے اس ادبی سفر میں تھکن نام کی کوئی شے در دروز تک نظر نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جس صنف کو سینے سے لگایا اور اسے اپنی ذہنی انگلیوں کا لمس عطا کیا اس صنف کا دامن وسیع اور روشن ہو گیا۔ ان کے علمی استعداد کے تمام تر جوہر جہاں شعری جلوہ گاہ میں معطر ہیں وہیں نثری بارگاہوں میں بھی منور ہیں۔ ہمارے ادب بابِ علم و فن کو یہ جان کر اچنبھا ہوگا کہ مولانا فدوی نے ہمارے افسانوی ادب کو بھی اپنے فکر و جذبہ سے مالا مال کیا ہے۔ ان کے افسانوں بالخصوص ”مامتا“، ”آتش خاموش“ اور ”موت کا کنواں“ (جو 1942ء سے 1945ء کے درمیان لکھے گئے تھے) کا محور ہماری زندگی کے بطن سے جنم لینے والی برائیوں کے خلاف جنگ اور اس جنگ سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں اس کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ تعجب اس بات کا ہے کہ آج تک مولانا فدوی نے اپنی فن کارانہ شخصیت کے اس پہلو کو بھی صیغہٴ راز میں رکھا۔ گویا انہوں نے اپنے آپ پر ایک طرح کا محصورانہ ظلم کیا ہے۔ اس ظلم کے سزاوار خود فدوی ہی نہیں بلکہ ہمارے اپنے نقاد اور ادیب بھی ہیں جو سستی شہرت کے ڈھنڈورچی بنے اپنے کھوکھلے نام اور کام کے طغے اپنی گردنوں میں لٹکائے بصد شان و شوکت ہر ادبی محفل کی زینت بنے رہتے ہیں۔

اردو کے شعری ادب میں کاغذ اور قلم کا رشتہ بہت نازک

اور اہم ہوتا ہے اس رشتے سے وفا کرنے اور اس رشتہ کو زندگی اور زندگی کو نئی جہتیں دے کر ایسے آفاقی سرحدوں تک اٹھانے والا شاعر ہی دراصل عظیم شاعر ہوتا ہے۔ آج کل ہمارے ارد گرد جو شاعر اپنی بے رنگ و روپ انانکی پرورش اور پرداخت میں کوشاں ہیں ان میں اس رشتہ کی پاس داری کا احساس ہے نہ پہچان، وہ دھوم دھڑلے کی شاعری کو اپنی انانکی شناخت اور اپنی ذات کی پہچان تصور کرتے ہیں۔ کاغذ اور قلم سے زیادہ ان شعراء کا شعری رشتہ سطحی جذبے اور مترنم آواز سے گہرا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے ترنم باز شعراء ہر مقامی اور کل ہند سطح پر سونے والے مشاعروں میں کامیاب و مقبول واقع ہوئے ہیں۔ مگر مولانا فدوی کی شاعری ان سطحی عوامل اور مضحمل عناصر سے بہت بالاتر اور پاک ہے۔ ان کے یہاں کاغذ اور قلم کے رشتہ کا وہ حسین سنگم ملتا ہے جس میں گنگا جمنی کیفیت کے ساتھ ساتھ جذبہ و فکر کی اچھی ترسیل پائی جاتی ہے۔ مولانا فدوی نے اردو شاعری کی تمام تر اصناف کو اپنی ذہنی روشنی سے آراستہ کیا ہے۔ بالخصوص صنفِ رباعی میں ان کے تبصر علمی اور فکری اُپچ کی وہ ست رنگ چھوٹ نظر آتی ہے۔ جو قاری کو امجد حیدر آبادی کے رباعیاتی جزیرے کے بہت قریب تر کر دیتی ہے۔

صنفِ رباعی کے تعلق سے یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ حالی و اکبر الہ آبادی نے اصلاحی رباعیات، مرزا یگانہ چنگیزی اور تلوک چند محرم نے مذہبی رباعیات (حمود مناجات) جوش، فراق و ساغر نے عشقیہ، خمریہ اور سماجی رباعیات اردو ادب کو دے کر اس صنف کو حیاتِ جاودانی بخشی ہے۔ جدید دور میں امجد حیدر آبادی نے رباعیات میں ایمانی، روحانی

اور عرفانی صداقتوں اور حقیقتوں کا وہ روشن آئینہ دکھایا ہے جس کے ماحول میں مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی اور علامہ اقبالؒ بھی تھے۔ اس اعتبار سے اردو ادب میں نعتیہ رباعیات کی اولیت کا سہرا یقیناً جنوب کے صوفی حضرت امجد حیدر آبادی کے سر جاتا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ حضرت امجد کے بعد دورِ جدید میں رباعیاتِ سیرت کے لیے علامہ فردوسی باقوی کا نام لیا جائے گا۔ مگر افسوس ہے کہ مولانا فدوی کی فنی اور فکری وسعتوں کو پرکھنے والی آنکھ آج دُور دُور تک موجود نہیں ہے۔ اور شمال کے بعض اکابر ادب کی صوبیاتی عصبیت کی شکار ذہنیت سے بھی اس کی امید کو ناعبت ہے۔

رباعیات

دل جوئیء حادثات کی ہر پہلو ! سلجھائے عروسِ زندگی کے گیسو
ہر گوشہ دل بنا ہمیں سے گلشن پھیلائی محبت کی ہمیں نے خوشبو



دم ساز الم ہیں، چارہ ساز غم ہیں لے دُور! نہ بھول ہم سے مخلص کم ہیں
کیا کہئے اب اور وصف ابنائے زماں ناقدروں کے درمیان فدوی ہم ہیں



کہنے کو بہت رفیق ہیں ہمدم ہیں دکھ درد میں ساتھ دینے والے کم ہیں
ہم ہر غم دنیا میں برابر کے شریک اپنا جو ہے غم اس میں تو تنہا ہم ہیں

لے مکتوب گرامی حضرت امجد حیدر آبادی۔ محرمہ 28، اکتوبر 1954ء
ڈاکٹر سلام سندیلوی

رباعیات

کرتا ہوں جو ذکر، با وضو کرتا ہوں کرتا ہوں ثنا تو قبلہ رو کرتا ہوں
جس پاک آرزو کا میں اہل نہیں! اللہ مرے وہ آرزو کرتا ہوں

وہ مہر کہ مہر جس سے ضویا تا ہے وہ ماہ کہ جس سے ماہ شرماتا ہے
دنیا میں ہے جس سے نور مطلق کی نمود دنیا میں وہ نور جلوہ فرماتا ہے

ہر نرم نظر میں روشنی تجھ سے ہے ہر انجمن دل میں زندگی تجھ سے ہے
یہ دانش و علم و آگہی بشر کی تھی یہ دانش و علم و آگہی تجھ سے ہے

طائف پر شاہِ ابدی کا ہوتا ہے نزول توحید کا پہنچاتے ہیں پیغام رسولؐ
اخوانِ شیاطین کے دلوں نے نہ کئے ایمان کے، عرفان کے، انوار قبول

اصنافِ سخن میں ہے رباعی مشکل سیرت کا بیاں پھر انتہائی مشکل
یارب! تو کشائندہ ہر مشکل - تھی ورنہ مجھے تو لب کشائی مشکل

اصنافِ سخن میں رباعی کو بہت مشکل صنف مانا گیا ہے۔ ایک طرف
اس کی مہیت، قیود و بند اور مخصوص اوزان جن کی وجہ سے اگر دامن تنگ
ہو جاتا ہے تو دوسری طرف غلوئے خیال اور کمالِ اعجاز اور آخری مصرع
میں زورِ بیان کی رفعت کی وجہ سے اس میں تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔ مذکورہ
تقاضوں سے عہدہ بردار ہونا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ لیکن مولانا فردوسی کے

پاس یہ مشکل مشکل نہیں رہتی۔ آج کل مولانا فدوی صنفِ رباعی کی طرف ہی نہیں بلکہ صنفِ نعت کی طرف بھی مائل نظر آتے ہیں۔ اور ان دونوں اصناف کے امتزاج سے جو رباعیاتِ سیرت وجود میں آ رہے ہیں وہ یقیناً اردو ادب کے ذخیرے میں گراں قدر اضافہ ہیں۔

مولانا فدوی کے سچے ہوئے سنجیدہ تنقیدی جھرنوں سے بھی مدراس کا اردو ادب سیراب و شاداب ہے۔ یہ سیرابی اور شادابی کے بہترین منظر ہمیں ان کی زیرِ تریب کتابیں ”حاصلِ مطالعہ“ اور ”سیارِ کانِ جنوب“ میں دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ اگر یہ دونوں کتابیں اشاعت کی منزل تک رسائی حاصل کر لیں تو یقیناً مدراس کے تنقیدی اردو ادب میں ایک اہم ترین اضافہ ثابت ہوں گے۔

سنہ 1974ء میں مولانا فدوی کی تالیف ”مجددِ جنوب“ باقیات الصالحات کے صد سالہ جشن کے موقع پر منظرِ عام پر آ چکی ہے۔ یہ کتاب وہاب العلوم شمس العلماء اعلیٰ حضرت عبدالوہاب کی مختصر سوانح حیات پر مشتمل ہے اس کتاب سے بانیِ باقیات عبدالوہاب کی مذہبی علمی اور دینی خدمات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

بحیثیتِ مجموعی مولانا فدوی باقوی کی شخصیت اور فنِ اردو ادب کی وسیع تر کائنات میں ایک آئینہ نور کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس میں اپنے دور کا کوئی بھی محقق اور مورخ اپنا عکس دیکھے بغیر تاریخ کی منزلِ ننگ باسانی نہیں پہنچ سکے گا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ مولانا فدوی کی پہچان اپنے دور کی پہچان ہی نہیں بلکہ اپنے عہد کی پرانی اور نئی نسل کی صالح قدروں کا شناخت نامہ بھی ہے :

کلام کا نمونہ

قصبات

آرزوؤ! تمہارے ہاتھوں آج جتنا ہونا تھا ہو چکے رسوا
اور آپہنچے اس مقام پر ہم ہیں کہاں کچھ پتہ نہیں چلتا

وہ ہمارے نہ ہو سکے لیکن اور کے ہو سکے کہاں ہم بھی
باہمہ دعویٰ زباں دانی اُن گلاگے ہیں بے زباں ہم بھی

زلفِ ہستی سنوارنے والے اپنی ہستی کے غم میں گھلتے ہیں
بے خبر اپنے آپ سے ہیں وہی جن یہ عالم کے راز کھلتے ہیں

عشق ناکام آرزو ہے ابھی حسن افسون رنگ و بو ہے ابھی
اہل عشرت کی محفلوں میں دل ایک ٹوٹا ہوا سبو ہے ابھی

ترے جہاں کی مجھے ذلتیں گوارا ہیں مگر مذاق میں اپنا بدل نہیں سکتا
تری روش، ترا جادہ تجھے مبارک ہو میں اک قدم بھی ترے ساتھ چل نہیں سکتا

ملا ابھی نہ ملا غم، سیدہ دل کو قرار برس رہے ہیں ابھی تک مری نظر سے شرار
تری نظر میں ہیں نیستے ہوئے بہار کے پھول مری نظر میں ہے لٹتی ہوئی چین کی بہار

ابھی راہ کے پیچ و خم میں ہیں ساقی قیود وجود و عدم میں ہیں ساقی
 بڑھا اور ان منزلوں سے کچھ آگے ہم اندیشہ بیش و کم میں ہیں ساقی

اشعار

- کہاں کا انقلابِ نو، کہاں کا آفتابِ نو
- پریشانی کے ماروں کی پریشانی نہیں جاتی
- جو دل کی ہے کیفیت اس کو الفاظ میں لانا مشکل ہے
- آساں ہے سب کی سُن لینا، اپنی ہی سنا نامشکل ہے
- ہم سے اخلاص کے ماروں یہ بنایم اخلاص ہر نفس اک کرم ہم نفساں ہوتا ہے
- کون دیتا ہے صدا سنت ہے کون گوش بر آواز ہم، آواز ہم
- پریشاں دل کی پریشانیاں ہیں سفینہ، تلاطم، تلاطم سفینہ
- عرفان کی یہی حد ہے تو ایقان کی یہی اصل
- اوہام سے نکلے تو پھر اوہام کو پہنچے
- راستہ راستہ نہیں دیتا ہے بہت دور بات منزل کی
- عمر بھر کہیں ہم نے دنیا سازیاں بن سکے فدوی نہ دنیا ساز ہم
- سینے کا فن نہ آیا، جینے کا نہ ڈبّا ہم کو
- آگے نہ بڑھا آگے اے دستِ طلب ہم کو
- یوں ہم نے نوازا ہے ہر نوع اسے فدوی
- بس رہ گئی ٹمکتی ہی دنیا کے ادب ہم کو
- ہو کوئی بزمِ فدوی صاحبِ فن صاحبِ فن ہے
- ہو کوئی بحرِ اس کی گوہر افشانی نہیں جاتی



مولانا راہی فدائی اور کڈ پیہ اردو

تحقیق، اور تنقید کا رشتہ بہت گہرا اور مضبوط رہا ہے تحقیق کے بغیر تنقید اور تنقید کے بغیر تحقیق ایک نامکمل سی تاریخ ہے۔ سقراط نے سب سے پہلے انسانوں میں تنقید کے جذبہ کو بیدار کرنے کی کوشش کی اور ہمیشہ اپنے شاگردوں سے کہا کہ ”سوچو اور پھر عمل کرو“، اُس دور کے یونانی حکمران سقراط کے ہم خیال نہ ہوئے۔ انہوں نے سقراط کے نئے خیالات کو رد کرتے ہوئے اس عظیم فلسفی کی آخری سانس تک کو سزا دی۔

پطراک سے پہلے رومی کھنڈرات کوئی معنی نہیں رکھتے تھے، وہ اینٹوں اور چٹانوں کے ایک ڈھیر سے زیادہ کچھ نہ تھے۔ پطراک نے لوگوں کو قصیر روم کی یادگاروں کی طرف متوجہ کرایا اور انہیں آثارِ قدیمہ کو قدر کی نگاہوں سے دیکھنے اور ذہنی طور پر ان میں دل چسپی لینے کا فن سکھایا۔ یہیں سے لوگوں میں تحقیق اور تنقید کا درک پیدا ہوا، اور انہوں نے عظیم کائنات کی عجیب و

غریب اور اپنی فہم و ادراک سے بالاتر پر پہنچ کھاڑیوں میں کھوجانا اور ان پیچوں سے نکلنا سیکھا۔ نشاۃ ثانیہ نے آگ پر تیل چھڑکنے کا کام کیا۔ نت نئی ایجادات معرض وجود میں آئیں اور تلاش و جستجو کی کرنوں سے نئے نئے انکشافات کے جزیرے رونما اور روشن ہونے لگے۔ اسی تحقیق اور تنقید کی برکت سے آج ہماری کائنات پر نور اور دیدہ زیب اور پُر کیف نظر آنے لگی ہے۔ اسی تحقیق اور تنقید نے بڑے بڑے فن کار، شاعر، ادیب، نقاد، معمار، نقاش، سنگ تراش اپنی کوکھ سے جنم دئے جو آسمانِ فکر و فن اور دنیا کی تاریخِ ادب پر نمبرِ اعظم بن کر چپکے۔

ہر فن کار کے اندر ایک نقاد بھی چھپا ہوا ہوتا ہے۔ جو فن کار کو ہمیشہ بیدار رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فن کار اپنے خارجی اور داخلی چیلنجوں کو قبول کرتے ہوئے اُن کا مقابلہ کرتا رہتا ہے۔ اور اپنی ایک جہا کا نہ راہ بناتا ہوا آگے کی سمت نکل جاتا ہے ورنہ ڈانٹنے کی ڈیوٹن کا میڈی، ہومر کی رزمیہ نظمیں، مائیکل آنجلو کی سنگ تراشی کا شاہ کار (Last Judgement) اور لیونارڈو ڈی ونچی کی نقاشی کا بہترین نمونہ (Last Supper) عالمِ شہود پر نہ آئے ہوتے، وائلیکی کی رامائن، دیاس کی جہا بھارت، کالی داس کی شکنتلا فردوسی کا شاہ نامہ، کبیر داس اور امیر خسرو کا فن، میر وغالب، مومن و اقبال کی شاعری وغیرہ زندہ جاوید نہ ہوئے ہوتے۔

مولانا راہی فدا کی شوقِ بیت اور فنِ اردو ادب کے وسیع تجربہ میں اس نور افشاں افق کی حیثیت رکھتے ہیں جس کی کرنوں سے نہ صرف سرزمینِ کلدیہ (آندھرا) اور ویلور (تمل ناڈو) کے دینی مدارس بلکہ ان کے ساتھ ساتھ ادبی تنقید اور علمی تحقیق کی فضا میں آج بھی روشن اور منور ہیں۔ راہی نے

جہاں تحقیق اور تنقید میں نئے معلوماتی دائروں کو وسعت اور کشادگی بخشی ہے وہیں اپنی غزلیہ شاعری کو کشش اور فکر، حیات آفریں اظہار، جلوہ نشاں احساس اور جذبہ کی ست رنگ دھنک سے لیس کیا ہے۔ موصوف کا سب سے بڑا کارنامہ یہ کہ آپ نے شاعری کی زبان میں جانوروں، کیڑے مکوڑوں سے کام لینے ہوئے آج کے معاشرہ کی اصلاح کی کوشش کی ہے۔ آپ نے بندر بناتے ہوئے، آلوؤں کے تقاب گراتے ہوئے، بچھوؤں سے ڈنک پر ڈنک لگاتے ہوئے آج کے انسانی ذہن میں جنم لینے والی درندگی کی تجویز منظر کشی کی ہے۔

راہی فدائی کی شعری تخلیقات سے ہٹ کر نثری تالیفات پر نظر جاتی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ مولانا نے یہاں بھی اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا بہترین ثبوت دیا ہے۔ آپ کی تالیفات میں سے پہلی تالیف ”مسک باقیات“ مطبوعہ ۱۹۹۱ء موجودہ مذہبی افراط و تفریط کے ماحول میں ایک طرح کی راہِ اعتدال کی نشان دہی کرتی ہے۔ آپ کی دوسری کتاب ”تجزیہ“ ہے (مطبوعہ ۱۹۸۸ء) جس میں مولانا نے اپنے گہوارہ علمی (مدرسہ باقیات صالحات ویلور) کے بانی حضرت علامہ شاہ عبدالوہاب صاحب قادری قدس سرہ کے بارے میں کی گئی غلط تاریخ نگاری کا مدلل رد فرمایا ہے۔

ایک اور تالیف ”باقیات ایک جہاں“ (مطبوعہ ۱۹۸۵ء) میں بانی باقیات اور اکابرین باقیات کے سوانحی اور علمی کارناموں نیز ادبی تخلیقات کو یکجا کر کے اپنی تعلیم گاہ کا بھرپور حق ادا کیا ہے۔

”اکسابِ نظر“ آپ کی چوتھی تحقیقی کتاب ہے۔ جس کے غائر مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا راہی فدائی میدانِ شاعری کے شہسوار ہی نہیں بلکہ مملکتِ نثر کے شہنشاہ بھی ہیں۔ موصوف نے بڑے انہماک اور بڑی

جانکا ہی سے جنوبی ہند کے چند اہم ادبی کھنڈرات اور آثار قدیمہ کی ازسرنو کھدائی کی اور تلاش و جستجو کے بعد بعض پوشیدہ خزانوں کو منصفہ شہود پر لا کر دنیا نے ادب کے معلوماتی ذخیرے میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔

بالخصوص دکنی و یلوری کے تحقیقی مضمون سے موصوف کی نکتہ رسی، تعمق نظری، تحقیقی اُپج اور بلند پیر داؤ جستجو کا انداز ہوتا ہے۔ مولانا نے جس خوبی سے محبت قائم کر کے مولوی نصیر الدین ہاشمی، مورڈاکٹر جمیل جالبی کے مغالطہ کو دور کیا ہے یہ کسی عام محقق کے بس کی بات نہیں۔

میں سمجھتا ہوں مولانا راہی کی اس تخلیقاتی ترقی اور ناموری میں شہر گد پیر اور مدراس کے چند اساتذہ کرام و علمائے عظام مثلاً حضرت مولانا سید شاہ محمد یعقوب بغدادی باقوی، حضرت مولانا محمد جعفر حسین فیضی صدیقی حضرت مولانا فذوی باقوی اور آپ کے شفیق استاذ اور مرشد روحانی شیخ الغفر حضرت علامہ سید شاہ عبد الجبار باقوی قادری دامت برکاتہم کی دعاؤں اور نیک تمناؤں کا خاص دخل رہا ہے۔ جس کا اعتراف بار بار راہی نے کیا ہے۔ اور راقم الحروف کی بھی یہ خوش قسمتی ہے کہ ان حضرات کی صحبتوں سے مستفیض ہوتے ہوئے اپنی دینی، علمی اور ذہنی پیاس بجھائی ہے۔

مولانا راہی سے راقم کے تعلقات دوستانہ اور برادرانہ نوعیت کے ہیں۔ راقم کو آپ کے اخلاص و مروت کے علاوہ مرنجان مرنج طبیعت اور صلح کل کے مزاج نے بہت متاثر کیا ہے اور اس کے علاوہ آپ کے پاس زندگی کو سنجیدگی سے سمجھنے اور برتنے کا شعور بھی نظر آتا ہے موصوف کی یہ خوبیاں یقیناً عطا ئے خداوندی ہیں۔ میرا یہ ايقان ہمیشہ رہا ہے کہ اس طرح کا تخلیقی اور آفاق گیر نقش چھوڑنے والا فن کار صرف عظیم ہی نہیں ہوتا بلکہ

عشقِ محمدی میں شہسوار و مخمور بھی رہتا ہے۔ یہ صفات مولانا راہی میں بدرجہ اتم موجود ہیں اور وہ عشقِ محبوبِ خدا کا ایک ایسا آئینہ ہیں جس کا عکس دینی آماجگاہوں سے نکل کر اردو ادب کی بارگاہوں میں جلوہ ریز و نقش گیر ہے۔

ایک مرتبہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار خاکی رحمۃ اللہ علیہ اپنے پیرومرشد حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمتِ بابرکت میں پہنچے اس وقت آپ کے ساتھ حضرت خواجہ بابا فرید الدین گنج شکر بھی تھے (جو بہت

کم سن تھے) خواجہ غریب نواز نے اپنے خلیفہ سے دریافت فرمایا: کہ بختیار نواز نے آج اس بازو بابا فرید گنج شکر کو کہاں سے پکڑا، یہ تو ساتویں آسمان پر پرواز کرے گا۔ راہی فدائی کی تنقید اور تحقیق سے متعلق میرا عقیدہ بھی یہی ہے۔

آخر میں میں یہی کہوں گا کہ مولانا راہی فدائی کی پیش نظر کتاب

”کڈپہ میں اردو“ سے تاریخِ ادب اردو میں ایک زرخیز باب کا اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف ایک مخصوص علاقے کے ادب کا جائزہ ہے، بلکہ اس کے توسط سے دنیائے اردو کی تاریخی اہمیت کو اجاگر کرنا اور اسے مناسب

مقام عطا کرنا مقصود ہے۔ ہماری اپنی تاریخیں چاہے کسی زبان سے متعلق کیوں نہ ہوں، جب تک اس میں علاقائی رجحانات کو فروغ نہیں ملے گا، اس وقت تک تاریخ کا حق ادا نہیں ہوگا۔ دہلی اور لکھنؤ کی ادبی تاریخ کی جس قدر

وقع اور اہمیت ہوگی اتنی ہی جنوبِ بعید کے غیر معروف شہر کڈپہ، ویلور اور آراکٹ کی ادبی تاریخ بھی اپنی خاص قدر و منزلت اور بلند و بالا شان و شوکت کی حامل ہوگی بشرطیکہ ہمارے غیر متعصب نقادوں اور محققوں کی نظر میں ہر ریاست کے فن کاروں کے کارناموں پر رہیں نہ کہ بھاری بھرکم شخصیت اور وطنیت پر۔

مطبوعہ: ”کڈپہ میں اردو“ 1992ء



صنفِ ادوہا اور ساغر جیدی

قدیم اصنافِ شاعرِ محرم میں ”دوہے“ نے ایک طویل سفر طے کیا،

اس صنف کی پرورش اور پرداخت میں حضرت امیر خسرو، کبیر داس، کالی داس اور عبدالرحیم خان خانان نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔

حضرت امیر خسرو نے اپنے دور میں گیتوں، کہم مکر نیوں اور دوہوں کے علاوہ ایک اور صنف اُن طے رے جوڑ، بے تکی، بے میل، پر بھی کافی توجہ دی تھی۔ اس نظم میں انہوں نے چند بے جوڑ چیزوں کو جن میں باہم کوئی علاقہ نہیں ہوتا ربط پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی تھی مثلاً :

کھیر کپائی جتن سے چرخہ دیا جلا

آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا

”جس دور میں ایسی نظموں کا رواج تھا، لوگ بولتے اور سمجھتے تھے“

اب نہ کوئی بولتا ہے نہ سمجھتا ہے۔ لہذا متروک ہے۔“ (مہذب اللغات: جلد اول ص 419)

”دوہے کے سم“ (پہلا اور تیسرا لخت) میں 13، اور ”و شم“ میں دوسرا اور چوتھا لخت میں 11 ماترائیں ہوتی ہیں۔ اسی طرح ہر مصرع میں 24 ماترائیں ہوتی ہیں۔ لیکن بقول ڈاکٹر گیان چند جین 24 یا 23 ماترائیں بھی ہو سکتی ہیں نمونہ یہاں 24 ماتراؤں والا کبیر داس کا ایک دوہا ملاحظہ فرمائیں:۔

منکا پھرت جگ گیا، من کا گیا نہ پھیر

پہلا چرن ۱۳ ماترائیں، دوسرا چرن ۱۱ ماترائیں

کر کا منکا چھاڑ کے، من کا منکا پھیر

تیسرا چرن ۱۳ ماترائیں، چوتھا چرن ۱۱ ماترائیں

آج جب بھی ”دوہے“ کا ذکر آتا ہے تو فوراً ہمارے ذہن میں جمیل الدین عالی اور نادم بلخی کی شخصیتیں ابھر آتی ہیں۔ ان دونوں شعراء نے اس صنف کے دامن کو وسعت اور کشادگی بخشنے کی جو شعوری کوششیں کیں وہ اردو ادب میں یقیناً ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

”دوہا“ قیۃ، میں صوفیانہ افکار اور درویشانہ تخیلات کے

اظہار کے لیے موزوں صنفِ شاعری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ صنف سادھوؤں سنّتوں، مذہبی رہنماؤں اور درویشوں کے ہاتھوں خوب پھلی پھولی اور پیران پڑھی۔ درویشوں اور صوفیوں۔ اس صنف کے ذریعہ اپنے دور کی سچائیوں، حقیقتوں اور حیات و کائنات کے رموز کی نقاب کشائی اور زندگی کے باریک نکتوں کی نشان دہی بڑے تیکھے اور نوکیلے انداز میں کی تھی۔ ان کے ہاں دوہے

لے ماہرین فن کے پاس قابل قبول نہیں ہے۔ تلسی داس نے بھی اپنے دور میں پہلے چرن میں ۱۲ ماترائیں اور دوسری چرن میں ۱۲ ماتراؤں کا تجربہ کیا تھا۔۔

کی صنف نصیحت آمیز اور عبرت آموز حقائق و دقائق سے بھرپور ہی نہیں بلکہ دنیا والوں کو راہ مستقیم پر کام زن کرنے کا ایک موثر ذریعہ بھی تھی۔

میرے نزدیک ایک اچھا دوا وہ ہے جو دل کی گہرائیوں سے نکل کر نہ صرف لوگوں کے دلوں میں جگہ بنا لیتا ہے بلکہ گھر گھر، گلی گلی اور بازاروں میں بھی اس کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ”دوہے“ سطحی اقدار اور تیسرے درجے کے ادب کے آئینہ دار ہوتے ہیں بلکہ یہاں یہ کہنا مقصود ہے کہ یہ صنف عام فہم، سیدھی سادی زبان میں اور ہلکے پھلکے لفظوں میں اپنے اندر خاص اشاریت، رمزیت اور ایمائیت کے ساتھ ساتھ گہرائی اور گیرائی کی بھی حامل ہوتی ہے۔

جدید دور میں اس صنف کو بہت زیادہ برتنے والے شعراء میں نذرا فاضلی، کرشن موہن، کرشن مراری، آزاد گلاٹھی، اور تنہا تماپوری قابل ذکر ہیں۔ ان تمام شعراء نے قدیم روایات کے مطابق ”دوہے“ کو ہندی مزاج بخشا ہے۔ لیکن کڈپہ کے مشہور و معروف، قادر الکلام شاعر ساعر جیدی کے دوہوں کو پڑھنے کے بعد خوشی اس بات کی ہوتی ہے کہ موصوف نے اس صنف شاعری کو اردو کے مزاج سے ہم آہنگ کرنے میں اپنی بھرپور خلافتانہ صلاحیتوں سے کام لیا ہے۔

محمد حسن عسکری نے جمیل الدین عالی کے دوہوں کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

”انہوں نے دوہوں میں مروجہ اردو میں ہندی کے دس پانچ مقبول الفاظ ملا کر ایک خاص زبان وضع کی ہے“

اسی طرح ساعر جیدی نے اپنے بیشتر دوہوں میں فارسی، عربی اور اردو کی لفظیات کا سہارا لے کر اس صنف کے خدو خال کو نمایاں بھی نہیں کیا بلکہ خوب صورت

الفاظ و ترکیب، استعارات اور تمثیلات سے ممزوج بھی کیا ہے۔ ساغر کے اس مستحسن عمل سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ صنف پر اکرتوں (شور سینی) آپ بھرنش کی نرم و سبک باتوں میں سانس لیتی ہوئی کئی زبانوں سے آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی اردو زبان سے اپنا ناتا جوڑ کر مقبولیت کی آفاقی سرحدوں سے جا ملی ہے۔

ساغر جیدی کے دوہوں میں وہ تمام تر خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں جو ”دوہے“ کی امتیازی خصوصیات کی بھرپور عکاس ہوتی ہیں۔

اگر ساغر جیدی کے دوہوں کا مطالعہ خالص ہندی کے درج ذیل شعراء کے دوہوں کے تناظر میں کیا جائے تو یہ بات ہمیں تسلیم کرنی پڑے گی کہ ساغر جیدی نے ”دوہے“ کی صنف کو اردو شاعری کا رنگ و روپ ہی عطا نہیں کیا بلکہ اس صنف کو سوندھی سوندھی خوشبوئیں بھی دی ہیں۔

خسرو رین سہاگ کی جاگی پی کے سنگ
تن مور و من پیو کو، دوو بھئے اک رنگ

_____ امیر خسرو

جلتے او بھن بلبہ جل ہی ماہی بلائے
تیسایہ سنسار سب موہی جائے سمائے

_____ عبدالقدوس گنگوہی

کا کا کرنگ ڈھا ڈھولیا، سگلا کھایا ماس
یہ دوی نی نامت چھوا، پیادیکھن کی آس

بابا فرید گنج شکر

صابن ساجی سانکی، گھر گھر پریم ڈبوئے

حاجی ایسا دھوئیے، بن نہ میلا ہوئے
_____ حاجی علی

رحمن پانی را کیوں پانی سب سون !
پانی گئے نہ اوجھارے موتی، مانس، چوَن

عبدالرحیم خان خاناں

میرا بچہ میں کچھ نہیں، جو کچھ ہے سو تو ر
تیرا بچہ کو سو نپتے، کیا لگتا ہے مور
کبیر داس

سَبَل سہا یک سَبَل کو کو وُ نَبَل سہائے
پون جگاد ت آگ کو، دیپ ہی دیت بچائے
ورند

کام کرو دمدا لو بھ کی جب لگی من میں کان
کیا مور کھ کیا پنڈتئی دو و ایک سماں
تلسی داس

اپنے سنگ کے جان کے، جو بن روپتی پروین
استن من نین نتمبھ کو ر و اضافہ کین
بہاری

نیا گھاؤ ہے پریم کا، جو چمکے دن رات
ہو نہار پروان کے، چکنے چکنے پات
فراق گورکھپوری

ساجن ہم سے لے بھی لیکن، ایسے ملے کہ ہائے
جیسے بوکھے کھیت سے بادل بن بر سے اڑ جائے
جمیل الدین عالی

من کی جوت سے تن کو اپنے کرے وہی اُجیا را
جیون کے آکاش پیس کا جگمگ جگمگ تارا

نادمِ یلخی

جیون کے بازار سے، ہوانہ کچے بھی پر اپت
ہم تو چلے سنسار سے، اپنا کھیل سماپت

کرشن موہن

پنچھی بالک، پھول پھل الگ الگ آکار
ماٹی کا گھر ایک ہی سارے رشتہ دار

ندا فاضلی

کہہ دو لے جائیں کہیں، سینے اپنا روپ
دیواروں کو بھانڈ کر، آنکھیں آئی دھوپ

یہ گوان داس اعجاز

کول کول مہ بھری، چٹون پر مسکان
چنچل چنچل دلیری، ساجن کی پہچان

کرشن مراری

جاگر بیٹھیں چار پل، کن پیروں کے پاس
ظفر ہمارے بھاگ میں شہروں کا بس باس

ظفر گورکھپوری

ساغر جیدی کے دوہوں میں ایک چونکا دینے والا خیال ملتا ہے۔ اور
ان کے صاف ستھرے لہجے میں دل فریب کیفیت نظر آتی ہے جس پر قاری سر دھنے
بغیر نہیں رہ سکتا۔ غزل سے لطف اندوزی تو ایک مُکَم بات ہے مگر دوہوں میں

رنگِ غزل کا سماں پیدا کرنا دو ہا نولیس کا ہی حصہ ہے۔ اور یہ خصوصیت ساغر جی کے ہاں بھی نمایاں ہے۔ میں نے اُن کے دوہوں کے مطالعہ کے دوران یہ بات محسوس کی ہے اور یقین ہے کہ ان کا ہر قاری یہی محسوس کرے گا۔ ذیل کے دوہوں میں جو میں نے بغیر کسی انتخاب کے لیے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ”یہ دوہے“ غزل کے مطالعوں سے کتنے قریب اور مزاجاً مینہ بھی ہیں :

- تیرا فن تیرا ہنر، سب کچھ تیرا کمال
- ہم تو گونگی چیز ہیں، ہم سے کیسا سوال
- نام نہ تھا اپنا کوئی، نہیں تھی اپنی نمود
- ہمیں وجود میں لایا ہے، آپ کا صرف وجود
- ہیرا ہوں یا کانچ ہوں، کیسے ہو چھپاؤں!
- کان ہی کان ہیں ہر طرف، ایک نہیں ہے زبان
- رشوت کے بازار میں، کیا شے ہے اخلاق
- پانی کی ایک بوند سے، بھیک گئے اوراق
- ہم نے چھپا کر رکھے تھے، طاق پہ سیٹھے طرف
- صبح قطار میں نکلے ہیں، چلتے پھرتے حروف
- ہنسے ہنسنے کاٹیں گے، صدیوں کی ہر کاشت
- لیکن قوم کی بزدلی، کون کرے برداشت
- سینہ اپنا تان لو، کچھ نہ رہے منطق
- پھول اگلنے آئی ہے، دو تالی بندوق
- چونک اٹھے گی نیند سے، آج ہر اک شہراہ
- ملازموں کی جیب میں، بجتی ہے تنخواہ

بعض دوہوں میں ساغر جیدی نے اپنے تخلص کے استعمال سے غزل کے
مقطعوں کا مزاج پیدا کیا ہے اور یہ حضرت امیر خسرو، کبیر داس، تلسی داس، عبد
الرحیم خان خانان وغیرہم کی ہی روایت کا ایک اعادہ ہے : ۷

• لے ساغر! پھول پھل سے، لدی ہوئی تھی شاخ

اسی کی ہو کر رہ گئی، میری نظر گستاخ

• ساغر! ایسے بیٹھے ہیں، ہم اپنوں کے : سج

ایک کھلونا کا بچ کا، دو بچوں کے : سیج

• ساغر! مجھ سے نہ پوچھئے میرا پتہ میرا نام

ٹوٹے پھوٹے طرف کے، ہوتے نہیں ہیں دام

• ساغر! ہم وہ قفل ہیں، جس کی نہیں ہے کلید

دہر کے ٹیڑھے ہاتھوں میں، ہم نہیں ہوں کے پلید

ساغر جیدی کے دوہوں کے مطالعہ سے بہ آسانی اندازہ ہوگا کہ ساغر

جیدی کہاں تک داد تحسین کے مستحق ہیں۔ میرے خیال میں اردو ادب میں موصوف

کا یہ تجربہ ایک جید مقام رکھتا ہے۔ اور اس تحسن تجربہ کے ذریعہ ایک قدیم صنف

پھر سے اردو کے راستے جو ان بن کر ابھر رہی ہے۔ یہ اردو کا ہی اعجاز ہے کہ وہ ہر

پرانے تجربے کو نئے چولے میں ڈھال کر اپنے اندر بڑی خوبی سے سمولیتی ہے۔

میں ساغر جیدی کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انھوں نے آنے والے

دور کو ایک نئی راہ اور ایک نئی روشنی سے روشناس کیا ہے۔ ❦



ڈاکٹر راہتی قریشی اور ”عکس کی ہیئت“

کلیم الدین احمد نے اردو غزل کو ”نیم وحشی صنف“ قرار دیتے ہوئے اس کے خلاف ہنگامہ ہی برپا نہیں کیا تھا بلکہ منظم طور پر ایک محاذ بھی قائم کیا تھا۔ کلیم الدین احمد کا مغرب زدہ ذہن شاید مغربی ادب کے علاوہ کسی بھی ادب کو قابل اعتماد اور درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ موصوف نے اردو غزل کے سلسلے میں ایسے غیر مہذبانہ اور ناگوار کلمات سے کام لیا ہے۔ کلیم الدین احمد کے اس بیان سے ہمارے ہاں کے چند ایک دعوے داران ادب متفق بھی ہیں۔ اکثر و بیشتر ناقدین نے موصوف کے اس بیان کی بھرپور مخالفت بھی کی ہے۔ راقم الحروف کے نزدیک اردو غزل کو نیم وحشی صنف کہنا ایک عظیم ادبی جرم کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اردو غزل نہ نیم وحشی ہے نہ نیم وحشی ماحول کی دین ہے۔ بلکہ یہ بڑی مقدس، پاک اور صلح آب و ہوا کا عطیہ ہے اور یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ذہن و دل کی کائنات کا روشن عکس جلوہ ریز ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس آئینہ میں اپنے عکس کا نظارہ کرنے والوں کے دل و دماغ اگر نیم وحشی ہیں تو انھیں اپنا

عکس نیم وحشی ہی نہیں نیم پاگل بھی نظر آئے گا۔

خوشی اس بات کی ہے کہ یہ صنفِ سخن شروع سے لے کر آج تک اتنی سحت جان ثابت ہوئی ہے کہ اس نے ہر دور کے ظلم سہے، طنز و تضحیک کے ستم اٹھائے مگر اس کی ہست، مقبولیت، سالمیت، پھیلاؤ، اپج اور دل پذیری میں نہ کہیں کوئی تغیر پیدا ہوا نہ تبدیلی کے نمایاں آثار۔ یہ وہ خوش نصیب صنفِ سخن ہے کہ ہزار ہا مخالفت کے باوجود اپنے روایاتی حسن، نئے نئے تجربات و عوامل اور زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں کے ساتھ ہمیشہ مقبول رہی ہے۔ اور تاقیامت رہے گی۔

ڈاکٹر راہی قریشی ایسے ہی غزل گو شعرا میں سے ایک ہیں جنہوں نے غزل کی عبادت گاہوں میں نہ صرف نمازیں پڑھیں بلکہ ان نمازوں کے پس منظر میں جو آئینہ صفت ذات پنہاں ہے اس کی نور آور کرنوں سے اپنے احساسات و جذبات کو معطر و منور بھی کیا ہے۔

کرنالک میں راہی قریشی کے علاوہ ضمیر عاقل شاہی، فضا کوثری، خمار قریشی، منظر محی الدین، خالد سعید، شکیل منطری، خلیل خاور اور انور مینائی نے اس صنفِ سخن کی پرورش اور مشاطگی میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔

فی الحال میرے سامنے ڈاکٹر راہی قریشی کا شعری مجموعہ ”عکس کی ہجرت“ ہے جس کے مطالعہ سے قاری کے ذہن و دل پر مرتب ہونے والے نقوش کا ذمہ دار ان کا ذات و کائنات کی حقیقتوں پر ایمان، انسانی عظمتوں کا اعتبار و ایقان، اور ناخواستہ دل برداشتہ رویوں اور رشتوں کے پھیکے پن کا سرسری اعلان ہے۔ انہماک و احساس کی زبان میں جہنمی تمازت نہیں بلکہ نیم سرد و گرم فضا سے گزرتی ہوئی تند ہواؤں کا لمس ملتا ہے۔..... فکر و تجربہ سے دوچار ہوتی ہوئی ان کی شعری تخلیقات ایک عجیب و غریب گداز سے قاری کو متاثر کرتی ہیں۔ ان

کے ہاں روایت کی پاس داری اور صالح قدروں کی عطر نشان یافتہ بہت زیادہ ہے اس کے ساتھ جدید لہجہ کا امتزاج ان کے فکر و جذبہ کو ایک جُدا اور منفرد خانے میں جگہ بخشتا ہے۔ ”عکس کی ہجرت“ میں راہی قریشی نے ”لِکَلِّ شَيْءٍ مَلَكُوتٌ“ (ہر چیز کے لیے ایک غیر کشف تمثیل ہے) کا بہت اچھا مظاہرہ کیا ہے۔ میرے نزدیک شاعری بذاتِ خود ذاتی اور کائناتی تجربات کی ایک بہترین تمثیل ہے۔ قدیم اصطلاح میں جس بات کو مجاز کہہ گیا وہی بات راہی قریشی کے پاس حقیقت کی تمثیل ہے۔

جن اشعار میں راہی نے ”آئینہ“ کا ذکر بار بار کیا ہے وہاں مجازی معنی سے زیادہ ایک حقیقت کی تمثیل ذہن میں اُبھرتی ہے۔

- ہر مسئلے نے بانٹ لیا ہے مرا وجود !
 - دنیا سے میرا کوئی تعلق نہ رابطہ
 - ہر شخص کے آگے ہے یہاں آئینہ راہی
 - منظر لہو، پیکر لہو، ہر عکس لہو ہے
 - آئینہ جھوٹا ہے، چہرہ جھوٹا
 - آئینہ بھی ہے عکس کی ہجرت سے سوگوار
 - مرے وجود میں روشن ہیں عیدِ مہر
 - یہی مہر ہے، یہی پناہ عیب ہے راہی
 - ہم کو بھی انتظار رہا ہے دیر سے
 - مرا وجود زمانے کا آئینہ ٹھہرا
 - کثافتوں میں بھی شفاف آئینہ رکھنا
 - جس طرح راہی قریشی نے ”آئینہ“ کی تمثیل کو وسیع اور کشادہ
 - سمیتیں بخشی ہیں اسی طرح اپنی غزلیہ شاعری میں ”چراغ“ یا ”شع“ کی تمثیل
 - سے اپنی فکری پرواز کو کہکشانی فضاؤں تک اونچا اٹھانے کی بھرپور کوشش
- کی ہے :

- اُجالا بخشنے والے! مجھے مکان بھی دے ”چراغ“ بن کے کسی دشت میں جلوں کی تہک
- آنکھن ہے انتظار کا صحرا بنا ہوا دہلیز پر ”چراغ“ سسکتا ہے دیر سے
- اس دشتِ انتظار میں بھیجتی نہیں امید روشن چراغ ”دیدہ“ بیدار اب بھی ہے
- رفتہ رفتہ ہوے بے نور بصیرت کے ”چراغ“

دل ہے روشن نہ کہیں دیدہ بینا روشن

- بھٹکنا مقدر ہے اس رہ گزر میں ”چراغ“ کفِ پا نہ تیرا نہ میرا
- بچھنے والی تھی؛ ابھی اک شمع کیج انتظار

ربط فرسودہ ہوا، وعدے پُرانے ہو گئے

- دہلیزِ ظلمتوں کے قدم روکتی رہی

شب کا ستم، ”چراغ“ سے مغلوب ہو گیا

- قتل ہوتے رہے چراغ وہیں لوگ جس راستے سے آئے گئے

”چراغ“ اور ”آئینہ“ ان دونوں تمثیلات سے راہی قریشی

’روشنی‘ اور ’عکس‘ کے تصور کو ابھار کر ایک اچھوتا مضمون مرتب کرنے میں پورے

طور پر کامیاب و کامران ہوئے ہیں۔ خود انسان خالقِ حقیقی کی ایماء کا ایک مظہر

ہے۔ وہ ذاتِ حقیقی کے نور کی ایک تمثیل ہے یا اُس کے علم و ارادہ کا ایک

حسین و جمیل عکس..... جہاں تک راہی قریشی کے کلام کے مطالعہ سے راقم

کے متاثر ہونے کا سوال ہے، میں انھیں مذکورہ احساسات سے گزرا ہوں اور

بہت محظوظ بھی ہوا ہوں۔ مجھے راہی قریشی کی ان اصطلاحات اور مفہام

سے لبریز شاعری بذاتِ خود اردو ادب پر بہت بڑا ادبی احسان لگتی ہے۔

جس طرح اقبال کے ہاں ”شاہین“ پرورش پایا ہے اُسی طرح

راہی قریشی کے ہاں ”آئینہ“ اور ”چراغ“ کی دو اصطلاحیں متعدد مفہام

کے عکس کے ساتھ رونما ہوئی ہیں۔

راہی قریشی اپنے معاصر شعراء میں یقیناً داد و تحسین کے مستحق ہیں جنہوں نے ”آئینہ“ اور ”چراغ“ کے ”عکس و روشنی“ سے اردو شاعری کو ایک نئی فضا اور نئے ماحول سے آشنا کیا ہے۔ حالاں کہ اس سے پہلے بھی اکثر و بیشتر قدیم و جدید شعراء نے ”آئینہ“ اور ”چراغ“ کی لفظیات کو اپنے کلام میں اپنے اپنے طور پر استعمال کیا ہے لیکن راہی قریشی نے ان دونوں لفظوں کو مجازی معانی کے مدار سے باہر نکال کر ایک سچائی اور حقیقت کی تمثیل کا حامل بنا دیا ہے یہ اردو ادب میں اُن کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

”عکس کی ہجرت“ کے انتساب میں ”عکسین“ کے نام گنوا کر راہی قریشی نے بڑی غیر ادبی جرأت کا اظہار کیا ہے اور پھر ایک فارسی شعر پیش کر کے اپنے دامانِ نگاہ کی تنگی اور گل ہائے حُسن کی فراوانی کے اعلان کے ساتھ اپنی ناآسودہ گل چینی کا بھی اقرار کیا ہے۔

بجائیت مجموعی خاموش احساسات کو غزل جیسی صدا بخشنے والی راہی قریشی کی شخصیت اور ان کا فن آج کے اُبھرتے ہوئے شعراء کے لیے ایک طرف مشعلِ راہ ثابت ہوتا ہے تو دوسری طرف ان کا شمار کہنہ مشق اور با شعور اکابرین کی صف میں کیا جائے گا۔

مطبوعہ روزنامہ ”سالار“ (ادبی ایڈیشن) بنگلور
۱۹۹۰ء



اکرام کاوش اور ”آبِ زر“

اگرچہ ادب کی تاریخ میں میسور ایک خاص مقام کا حامل ہے۔ یہاں اردو زبان کی نشوونما دیگر قدیم مراکز کے برخلاف جنگ و جدال اور ضرب و قتال کے دوش بدوش جا رہی ہے۔ سلطنتِ خداداد کے قیام سے بہت پہلے یہاں دکنی اردو یعنی قدیم اردو کا چلن عام ہو گیا تھا اور اس کی ترقی و ترویج کی لگن پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ عبدالمومنؒ مہدوی چنیا پٹن نے (جنہیں ڈاکٹر عابد صفی نے اپنی تحقیقی مقالہ ”ٹمل ناڈو میں اردو نثر کا ارتقاء“ میں مدراس کا باشندہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے) 1036ھ 681ء میں ”اسرارِ عشق“ نامی ضخیم مثنوی دکنی اردو میں لکھتی

اے ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخِ ادبِ اردو جلد اول ص 133 میں عبدالمومن مومن کو مومن بجا پوری لکھا ہے۔ مگر ان کے بجا پوری ہونے کی کوئی سند نہیں دی ہے۔ مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ آگے چل کر موصوف نے مومن کا وطن سینا پٹن بھی بتایا ہے۔ ص 368۔ حقیقتاً مومن مہدوی چن پٹن (ریاست کرناٹک) کے باشندے تھے۔ جو کبھی لسانی تقسیم سے پہلے ٹمل ناڈو قدیم (مدراس) میں شامل تھا۔

شروع کی جس کا اختتام ۱۵۹۳ء میں ہوا۔ اسی طرح حضرت شاہ محمد صدر الدین ولد حضرت شاہ میراں ولی اللہ ملقب بہ منزوی الجبلین (مدفون باو آدم پہاڑی، مضافات دشارم، ضلع شمالی آرکاٹ، مدراس) نے ”مرآۃ الاسرار“ نامی رسالہ ۱۱۳۳ھ میں اپنے فرزند محمد امیر الدین کے مطالعہ کے لیے تصنیف کیا تھا۔

عہدِ سلطنتِ خداداد میں میسور میں اردو کو کافی فروغ حاصل ہوا، شمالی ہند سے بھی اہل علم و فضل یہاں کی علمی قدر دانی کے زیر اثر آنے لگے۔ جیسا کہ اللہ مہتاب رائے سبقت، نواب حیدر علی خان کے دور میں یہاں آکر آباد ہو گئے تھے، جو ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ اور جنھوں نے ۱۱۹۱ھ میں اپنا کلام ”شمع مجلس“ کے نام سے ترتیب دیا تھا۔ اسی طرح ٹیپو سلطان شہید کے میر منشی زین العابدین شوستری نے سلطان کے حکم پر ۱۲۵۳ء میں ”فتح المجاہدین“ تصنیف کی تھی اور سلطان کے درباری شاعر حسن علی عزت نے حسب الحکم سلطانی شہید ۱۲۵۵ء میں ”مفرح القلوب“ دکنی زبان میں تصنیف کی تھی۔ ان کے علاوہ شہرہ آفاق مورخ میر حسن علی کرمانی متخلص بہ حاکم ولد سید عبدالقادر کرمانی ۱۲۲۱ھ میں ”بحرِ فوارت“ نامی قواعدِ فارسی پر مشتمل رسالہ دکنی زبان میں اور ”تجنیس اللغات“ نامی لغات بھی مرتب کی۔

عہدِ کرشناراج و ڈیر سوم (۱۷۹۹ء تا ۱۸۳۱ء) میں اردو زبان نہ صرف میسور میں زور و شور اور دھوم دھام سے پھیلی پھوٹی بلکہ میسور کے اطراف و کناف کے علاقوں میں بھی اس نے اپنی ہر دل عزیزی کے گہرے نقوش چھوڑے تھے۔ چنانچہ سید ابراہیم درگا ہی (المتوفی ۱۸۵۵ء) اور حضرت میر حیات

لے آپ مدرسہ لطیفیہ ویلور (شمالی آرکاٹ) کے فارغ التحصیل تھے۔

ابن میر یوسف حسین کولاری نے اپنی بیش بہا تصانیف اور نواب محمد حسین سلطان نسیم میسوری (متوفی اپریل 1888ء م 1305ھ) سے عوام و خواص کے قلب و نظر میں اپنا خاص اور نمایاں مقام بنالیا تھا۔ غلام حیدر سرور میسوری (مصنف "شش لطائف" محرہ 1236ھ) اور عبدالحق (مصنف "چھوٹی کرسی") بھی اسی دور کے یادگار مصنفین میں شمار ہوتے ہیں۔

عہد انگریز (1831ء - 1881ء) کے دوران میسور میں اردو کی رفتار اور بھی تیز تر ہوئی۔ چنانچہ سید اسحاق سالم، غلام عابد (ولادت 1221ھ) ابوالحسن ناظر (ولادت 1811ء) حضرت سید شاہ شہاب الدین شہاب (متوفی 1905ء) وغیرہم اس دور کے یادگار اور میسور کی ادبی تاریخ کے زندہ اور روشن کردار ہیں۔

چامراج و ڈیر کے زمانے میں اردو کی ترقی تیز تر نہ تھی اطمینان بخش ضرور یہ ہے۔ چنانچہ منشی سید عبدالحی سبزواری (1334ھ) حضرت سید شاہ فقیر محی الدین قادری مقبل میسوری (متوفی 1346ھ) منشی غلام محمود صفی (متوفی 1916ء) مولانا عبدالحق عرف امیر (متوفی 1916ء) حضرت مولانا سرقاضی درویش پیراں قادری (متوفی 1923ء) محمد قاسم انصاری قسیم میسوری ظہیر عاقل شاہی (متوفی 1961ء) اور حضرت ضمیر عاقل شاہی اور غوث احمد علی خان افسر (متوفی 1961ء) نے شہر میسور کی اردو روایت کے ایہں اور زبانِ اردو کے بہی خواہ، مخلص خادم و جانثار تھے۔

لے "مصباح الحیات"، "خمسہ حیات"، "شمع حیات"، "شمع محفل"۔

لے مصنف "لالہ صحرا" اور اُجالوں کا سفر۔

عہد حاضر میں بھی شہرِ میسور میں اردو زبان خوب ترقی پذیر ہے۔ یہاں کے ادباء و شعراء کی کثرت اور اس گلشنِ علم میں اہل فضل و کمال کی آمد و رفت نے یہاں کی علمی اور ادبی سرگرمیوں میں ذینہ بہ زینہ، منزل بہ منزل اضافہ کیا ہے اور یہاں کے ادبی ادارے مثلاً ”بنیم اردو“، ”بنیم اقبال“، ”انجمن اتحاد المسلمین“ اور محبوبیہ مکان کے مشاعروں نے اردو کی خدمت کو اپنا نصب العین بنا رکھا ہے۔

اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے سلسلہ کی ایک نہایت اہم کڑی جناب اکرام کاوش مؤلف ”داستانِ میسور“ اور مصنف ”حرفِ نرین“ ہیں جن کے اندر کا فن کار بہت توانا، حوصلہ مند، فراخ دل اور روشن نظر بھی ہے۔

اکرام کاوش کا شمار کمر نالک کے اُن شعراء میں ہوتا ہے جن کی شاعری روایات کی صلح قدروں کی پاس داری اور نئے ادراک و احساسات کی بوقلمونی سے جلوہ ریز ہے۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اُن کی شاعری قاری کو چاہے وہ غزل ہو یا نظم الفاظ کی جادوگری، کرب و بے بسی اور علامہ کے دلدل میں ڈبوئی ہے اور نہ احساس و جذبے کی نا آسودگی کے بھور کی طرف کھینچ لے جاتی ہے۔

اکرام کاوش نے اردو شاعری کی مختلف اصناف کو درد، کسب، خوشی و انبساط، رنج و الم اور نئے تجربات کی روشنی سے ہم کنار ہی نہیں کیا بلکہ اپنے کرب و احساس کے اظہار کے لیے بڑی عام فہم، سیدھی سادی زبان کا سہارا بھی لیا ہے۔ ان کے ہاں فکری بیکرائی، کشادگی، رمزیت اور وسعتِ ایمائیت کی تلاش بے سود ہے مگر ان کے جذبات و احساسات سے جو لطیف پیکر ابھرتے ہیں وہ ان کے ماضی اور حال کے مدار میں اُچھلتے کودتے، چلتے پھرتے، ہنستے کھیلتے اور گنگناتے ہوئے مناظر پیش کرتے ہیں۔ جن کا پس منظر ذہن و دل پر ایک گہرا تاثر نقش کرتا ہے.... سچ تو یہ ہے کہ ان کا زیرِ نظر مجموعہ ”آبِ زر“ کی

ہر نظم میں ان کی اپنی ذات مختلف پہلوؤں اور مختلف سمتوں میں سانس لیتی ہوئی
محسوس ہوتی ہے۔ ان کی بعض نظمیں مثلاً ”تو کہاں ہے“، ”کہاں تک چلو گے“،
”نیا رشتہ“ اور ”نظارہ“ مختصر ترین، جامع اور خوب صورت احساس و
جذبے کی آئینہ دار ہے

کہاں تک چلو گے

کہاں تک
تم میسر ساتھ چلو گے
میں ہوں اک صحرا نورد
میسر قدموں تلے
سارے عالم سانس لے رہا ہے

نیا رشتہ

چلتے پھرتے جسموں کا رشتہ
سانسوں تک محدود
قبر سے آگے
کون کس کا ہے ؟
کس کو خبر

نظارہ

سیاہی پھیل کر
روشنی کے وجود میں ضم ہو گئی
اور ہم چپ چاپ
بلندیوں کی آنکھوں سے دیکھتے رہ گئے

قرینہ امارہ

اک مدت سے
وہ وحشی
میکر انڈر بند تھا
پھر سے وہ
زندان سے باہر آ گیا ہے
تاکہ ہر اک کام پر
حسرتوں کے تازیانے سے
مری خاطر کرے
تاکہ پھر
صبر کے رستے پر
میری بدنامی میں
کچھ کسر باقی نہ رہے

کالی مسرت سے گریز

کہیں لمحاتی خوشی کی خاطر

صدیوں کی آسودگی سے

ناطہ توڑ لیا جاتا ہے

تم ہی انصاف کرو آخر

وہ دل جس میں بے پناہ محبت ہے

وہ نظر جس میں اُفق تاب روشنی ہے

وہ گفتگو جو خطرِ راہِ فکر و فن ہے

وہ ساتھ جو بہاروں کا نعم البدل ہے

وہ تحریر جس سے روح بالیدہ ہے دماغ روشن ہے

ان سب کا کیا ہوگا

کیا مصلحت صداقت کی جگہ لے سکے گی

اُن دنوں کو تم کیسے بھلا سکو گے

جن دنوں کچھ لوگ گروہ میں بٹ کر گئے تھے حملہ آور ہوئے تھے

یہ رات رات ہے اے دوست

تم بغور دیکھو اس شبِ تیرہ و تار کو

میکر و لو لے میرے جذبے میکر جنون کو تو دیکھو

خدا کے لیے بغور دیکھو میکر دامنِ تار تار کو

تم عدل کی ڈور اپنے ہاتھ میں لے لو

اور گریز کرو

اُس کالی مسرت سے

تو کہاں ہے ؟

میکر معبود
تیکر دربار میں
محوِ سجدہ ہے ادراک
اور ادراک کی وسعتیں
مگر
تو کہاں ہے.....

خوشی اس بات کی ہے کہ پیشِ نظر مجموعہ ”آبِ زر“ میں کرناٹک کے نام نہاد شعرا کی نظموں کی طرح اکرام کاوش کی نظموں میں اپنے ”ہم عصروں کی بازگشت“ کہیں بھی سنائی نہیں دیتی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اسی روش سے اکرام کاوش کا ذہنی سفر جاری رہے گا تو مستقبلِ قریب میں وہ اپنی الگ پہچان اور شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔



عبدالقادرا دیب... نشائیہ نگار

ایک زمانہ تھا کہ اردو ادب میں انشائیہ نگاروں کی بہتات تھی، پھر ایک دور ایسا بھی آیا کہ صنفِ انشائیہ کے فن کاروں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی لیکن ۱۹۶۰ء کے بعد اس صنف کے بہی خواہوں اور اپنانے والوں کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے خصوصاً ۱۹۶۱ء اور ۱۹۶۶ء میں جب ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں کے مجموعے ”خیال پارہ“ اور ”چوری سے یاری“ تک منظر عام پر آئے تو پاکستانی اردو ادب میں ایک ہنگامہ سا برپا ہوا اور پاکستان کے کئی باشعور فن کاروں نے اس صنف کی طرف خاص توجہ دیتے ہوئے اس صنف میں اپنے نئے احساسات، تجربات اور مشاہدات کے جوہر دکھائے جن فن کاروں نے اس صنف کو نئی زندگی اور نئی توانائی بخشی ان میں ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر وزیر آغا، جمیل آذر، شہزاد منظر، حیدر قریشی، غلام جیلانی اصغر، حامد برگی اور سلیم آغا قزلباش کے نام قابل ذکر ہیں۔ مندرجہ بالا

انشائیہ نگاروں کی فہرست میں معدودے چند انشائیہ نگاروں نے اس صنف کو بہت اونچا ہی نہیں اٹھایا بلکہ اسے ان ارتقائی بلندیوں تک پہنچایا ہے جہاں فکر و احساس کی وسعتوں کا نور اور دل و نگاہ کے آفاقی رشتے استوار ہیں۔

۱۹۶۶ء کے بعد پاکستانی ادبی ماحول میں اس صنف کے کئی مجموعے

منصہ شہود پر آئے ہیں۔ خاص طور پر ڈاکٹر انور سدید کا مجموعہ ”ذکر اس پری و شکر“ اور جمیل آذر کا مجموعہ ”شاخِ زیتون“ واقعی اس صنف کی مقبولیت، نئی کشادگی، گہرائی و گیرائی اور نئی تجلیاتی شعور کے ضامن ہیں۔

ہندوستان میں اس صنف کو اپنانے والوں کی تعداد مختصر سہی لیکن جن فن کاروں نے اس صنف کو سنجیدگی کے ساتھ اپنایا اور سلیقہ سے برتا ہے ان میں (دورِ قدیم میں) وحید الدین سلیم بانی پتی، خواجہ حسن نظامی، پریم چند، پطرس بخاری، مرزا فرحت اللہ بیگ کے نام قابل ذکر ہیں۔ جن کے انشائے زندگی اور سماج کے رشتے، حیات و کائنات کے رابطے، صالح روایاتی اقدار، ادبی کلاسیکی وقار کی بھرپور چاشنی لیے انشائے کی صنف میں اضافے کی یہ شیت رکھتے ہیں اور دورِ جدید میں کنہیا لال کپور، احمد جمال پاشا، زینت ساجدہ اور کرناٹک کے عبدالقادر ادیب کے انشائے ایک نمایاں شیت کے حامل ہیں۔

عبدالقادر ادیب شہرِ بنگلور کے کہنہ مشوق شاعر اور سلجھے ہوئے انشائیہ نگار اور پیشے کے اعتبار سے وکیل ہیں۔ انہیں مقدمات کی پیروی کے سلسلے میں مختلف لوگوں کی افتاد طبع، جذبات اور نفسیات کا ژرف نگاہی کے ساتھ مطالعہ کر کے مواقع میسر آتے ہیں۔ زندگی کے گہرے تجربات کی دھیمی آنچ سے احساس کا آنچل آہستہ آہستہ سلگنے لگتا ہے تو تخلیق کی فضا

میں مختلف رنگوں کی پھوٹ سے قوس قزح کی پیدائش ہوتی ہے۔ قوس قزح کی یہ ست رنگیں خود عبدالقادر اویسی کی زندگی بھی ہے۔ ان کی سدا بہار شخصیت چنبیلی کی چھاؤں تلے سانس لیتی ہوئی کائنات کی طرح ہمیشہ خوش بو بکھیرتی رہتی ہے۔ لیکن ان کے انشائیوں میں زندگی کا کرب، احساس کی اذیت محسوس ہوتی ہے۔ انہوں نے نگار خانہ حیات کی لذت کو محسوس کیا ہے، زندگی کی اذیت کو، کرب اور درد کو قریب سے پہچانا ہے۔

ان کے انشائیوں کے تجزیاتی مطالعے نے مجھے یہ کہنے پر مجبور کیا ہے کہ ان کی ہنسی، مسکراتی اور پھول برساتی شخصیت کے پس منظر میں اُٹتے ہوئے آنسوؤں، آہوں اور فریادوں کا سیلاب حصار توڑنے کی کاشاکش میں کار فرما ہے۔ لیکن اس بلند حوصلہ فن کار نے دامن ضبط کو بڑی مضبوطی اور سنجیدگی سے تھاما ہے۔ ان کے شفاف ماتھے پر شکنوں کے جال نہیں بچھے ہیں ان کی آنکھوں میں اداسی اور غم کے سائے نہیں منڈلاتے ہیں۔ ان کے خط و خال سے غم کی اذیت ناکی مترشح نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ ہنستے رہتے ہیں، مسکراتے رہتے ہیں۔ ان کے وجود کے مختلف درجوں سے روشنی کی کرنیں چھنتی ہیں لیکن ہو سکتا ہے انہوں نے اپنے انشائیوں میں جس درد کو الفاظ کا پیرہن بخشا ہے وہ درد ان کی تنہائی میں اُٹے ہوئے آنسوؤں کو اپنے نادیدہ دامن میں جذب کر لے۔

عبدالقادر اویسی کا جمالیاتی احساس نہایت توانا اور صحت مند ہے ان کے ذوقِ جمال نے رہ گزرِ شوق کو بھی اتنا اونچا اٹھایا ہے کہ ان کی رہ گزرِ شوق میں قدم قدم پر کہکشاں کی بساط بچھ جائے۔ بے پناہ مصروفیات کے عالم میں لمحات کی انگلی تھامے وہ ایسے انجان راستوں کا سفر اختیار کرتے ہیں کہ انھیں راہ کے نشیب و فراز کی فکر ہوتی ہے نہ منزل کی تلاش۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ

وہ منزل سے بے خبر ہیں لیکن وہ منزل کی جستجو میں ہیجانی کیفیت کا شکار نہیں ہوتے۔ ویسے اُن سے پہلی ملاقات میں اس کا احساس ضرور ہوتا ہے کہ یہ فن کار جو ایڈوکیٹ بھی ہے، مہذب و شائستہ بھی ہے، باغ و بہارِ نصیبت کا مالک بھی ہے، کسی بوکھلاہٹ کا شکار ہے۔ لیکن یہ لمحاتی تاثر دیر تک قائم نہیں رہتا۔ مسلسل ملاقاتوں کے بعد اس نتیجے پر پہنچنے میں دشواری پیش نہیں آتی کہ عبدالقادر ادیب کی کشش انگیز شخصیت چاہے جانے کے قابل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میرا نظریہ غلط ہو، لیکن جو کچھ محسوس کیا ہے اس کے اظہار میں اغماض سے کام نہیں لیا ہے۔ عبدالقادر ادیب کی صحت مند تخلیقات میں ابھی تجریدی آرٹ کے منظر نظر نہیں آتے چوں کہ شاید ان کی افتادِ طبع کا تقاضا یہی ہے کہ علامت کی بھول بھلیوں میں قاری کے ذہنی انتشار کی کوکو بڑھانے کی بجائے مافی الضمیر واضح طور پر ظاہر کر دیا جائے۔ آج کل جس طرح جدید شاعری نے اپنے سانچے بدلے ہیں، ابلاغ خیال کے سلسلے میں جو نئے اسالیب سامنے آئے ہیں کرناٹک کے بعض فن کاروں نے بھی انہیں اسلوب کو اپنایا ہے۔ جن میں محمود آیاز، راز امتیاز، حمید الماس خلیل مامون، فضا کوثری، قابلِ ذکر ہیں۔ یہ بڑی مسرت کی بات ہے کہ انہوں نے تجریدی آرٹ کے صحیح مصرف کو سمجھا ہے، پرکھا ہے اور جانا ہے۔

عبدالقادر ادیب کے یہاں تجریدی آرٹ کے عناصر کا فقدان ہے لیکن روایات کے صالح اور روشن عناصر ان کی تخلیقات میں اس طرح سما گئے ہیں کہ گویا یہ ناخن کا قرض پڑے خلوص، رچاؤ اور ذمہ داری کے ساتھ ادا کر رہے ہیں۔

مجھے بے حد خوشی ہے کہ آج کرناٹک کے فن کاروں میں تخلیق عمل اپنی بھرپور شدت اور توانائی کے ساتھ کارفرما ہے۔ خصوصاً جدید ترین نسل

میں سلیمان خمار، شکیل منظہری، راہی قریشی، خمار قریشی، فیاض قریشی، خلیل خاور
 خالد سعید، رزاق آفسر، اکرام کاوش، الف احمد برق، جبار جمیل، نیر احمد جامی
 سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ اور میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں
 کہ یہ جدید ترین نسل کا قافلہ اپنے فن کے ساتھ ہی نہیں بلکہ اپنی تہ دار
 شخصیت کے ساتھ بھرپور انصاف کرے گا۔ ●●

مطبوعہ "سالار" بنگلور۔ ادبی ایڈیشن

۱۹۸۲ء



یعقوبِ اہم کی افسانہ نگاری

تامل ناڈو کی سرزمین پر بہت کم شاعر ایسے پیدا ہوئے ہیں جن کے اندر شعری حسیت کی ست رنگ چھوٹ کے ساتھ ساتھ نثر نگاری کی صلاحیتوں کا بالخصوص افسانہ نویسی کی آفاق گیر وسعتیں بھی موجود ہیں۔ تامل ناڈو میں اردو افسانہ نگاری کی عمر مختصر ہی تھی، لیکن جن افسانہ نگاروں نے اس صنف کو نئی جہت سے آشنا کرنے اور متنوع پہلوؤں سے معمور کرنے میں اپنی بہترین اور گراں قدر صلاحیتیں صرف کی ہیں ان ادیب بھارتی، راز امتیازہ رشید مدراسی، انور ربانی، سبیل عرفان، حسن فیاض، انور کمال، شبیب احمد کاف اور راقم الحروف کے نام قابل ذکر ہیں۔

مذکرہ بالا افسانہ نگاروں کی تخلیقات کے مطالعہ کے بعد یہ بات باسانی محسوس ہونے لگتی ہے کہ ان کے افسانوی جذبات کی مہک شعری دیکھنے سے درآئی ہے اور اس ہوا میں جہاں نئے اور پرانے موسموں کی بھینی بھینی خوشبو

موجود ہے وہیں درد کی میٹھی میٹھی کسک بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کہتے ہیں کہ کہانی اور افسانہ ایک بنیادی فن ہے جو بڑی محنت اور عرق ریزی سے ہاتھ آتا ہے۔ اور یہ فن رفتہ رفتہ بڑھنے والے کے رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے اور انسانی احساس بن کر جسم کے تمام اعضا میں گھل مل جاتا ہے۔

تامل ناڈو میں راز امتیاز کے افسانے بیدی کے بیان کی بھرپور آئینہ داری کرتے ہیں۔ جہاں تک میرے مطالعہ اور سمجھ کی دوڑ کا تعلق ہے میں تو یہی کہوں گا کہ راز امتیاز نے اگرچہ شاعری کے مقابلہ میں افسانے بہت کم لکھے ہیں لیکن انہوں نے جو بھی لکھا ہے ان میں زندگی کی توانا قدروں کو اور ان کے اطراف و اکناف مچلتی مہکتی مسکراتی اور مسکتی ہوئی صداقتوں اور ان صداقتوں کی کوکھ سے جنم لینے والی بے شمار تلخیوں کو بڑے تیکھے انداز میں اجاگر کرتے ہوئے افسانے کی صنف کی حدوں کو آسمان فن کی لا زوال قدروں تک پہنچایا ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ تامل ناڈو کے مذموم، ہلک اور اردو دشمن ماحول نے کبھی اس فن کار کی ہمہ جہت ادبی صلاحیتوں کی تبصر علمی اور ژرف نگاہی کی قدر نہیں کی۔

تامل ناڈو میں افسانہ نگاری کی ایک اور کھیپ ایسی بھی موجود ہے

جس کا رشتہ روایت پرستی سے بہت گہرا اور بڑا ہی مضبوط ہے اور جن کی تحریروں کا ناظر ہنوز اس سرحد کو چھو نہ سکا جس کا رشتہ انت نئے سوچوں کی آفاقی وسعتوں سے جا ملتا ہے۔ یعقوب آسلم بھی انہیں افسانہ نگاروں

میں سے ایک ہیں لیکن ان کے افسانوں میں کہیں کہیں روشن امکانات کی خوش آئند لکیروں کا احساس بھی اجاگر ہوتا ہے۔ ان کے افسانے روایتی

ہوتے ہوئے بھی تدقیق کے عمل اور بھرپور فکری آپج سے قریب ہیں۔
 یعقوب اسلم کے بعض افسانے مثلاً ”مزاج گرامی“، ”مجھے سکون چاہیے“، اور ”انٹرویو“ صنفِ انشائیہ کی سونڈھی سونڈھی مہک اور اس کے روشن دائرے کے اندر جنم لینے والی چمک دمک سے درخشندہ نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید کے لفظوں میں انشائیہ اردو ادب کی ایک ایسی صنفِ اظہار ہے جس کے مختلف ٹکڑے بے ترتیب صورت میں متعدد قدم اور جدید نثر نگاروں کے مضامین میں بکھرے پڑے ہیں۔ اور یعقوب اسلم نے انہیں منتشر اور پراگندہ ٹکڑوں کو یکجا کر کے انہیں اس موجودہ دور کی کشمکش اور پراگندگی، زبوں حالی اور کشاکش سے ممنوع کرنے کے بعد ایک نئی کیفیت سے ہم آہنگ کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ جہاں تک ان کے افسانوں کے پلاٹ اور تھیم (Theme) کا تعلق ہے یہ روزمرہ کی زندگی اور اس کے ارد گرد سانس لینے والے ہلکے پھلکے واقعات پر مشتمل ہے۔ آج کا انسان جو ایک کلرک بھی ہے اور ایک گھریلو فرد بھی، ایک ذمہ دار باپ بھی ہے اور ایک محبت کرنے والا شوہر بھی۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی اس قدر عظیم شان ترقی اور صنعتی دور کی فراہم کردہ بے شمار سہولتوں کے باوجود زندگی کی قدیم ترین پامال اور بوسیدہ قدروں سے اپنا دامن نہیں بچا سکا ہے۔

یعقوب اسلم نے اپنے افسانوں میں ایسی ہی لازوال قدروں کی منظر کشی کی ہے اور بتایا ہے کہ ایسے ہزاروں صنعتی انقلابات اور سائنسی ترقیاں مل کر بھی زندگی کی ابدی اور بنیادی ضرورتوں کا کوئی خاطر خواہ حل نہیں

پیش کر سکتیں۔ روزِ ازل ہی سے آدمی ان کا محتاج رہا ہے اور تا ابد رہے گا۔ چنانچہ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں :-

”مگر ہم سوچتے ہیں تو ہمیں بڑا تعجب ہوتا ہے کہ کیا یہی آپ کی دعا ہے کہ ہماری قمیص پر اس وقت دنیا بھر کے بڑے اعظموں کے نقش بنے ہوئے ہیں۔ زندگی کی انتہائی ضروری اشیاء کی قیمتیں آسمانوں پر کمندیں پھینک رہی ہیں۔ تین مہینوں سے بچوں کے اسکول اور کالج کی فیس جمع نہ ہو سکی۔ بیگم صاحبہ کئی مہینوں سے ایک ساڑی کے لیے اصرار کرتے کرتے چپ سادھ چکی ہیں اور اس وقت ہمارے سامنے ایک سب سے بڑا اور بین الاقوامی مسئلہ یہ اکھڑا ہے کہ اس وقت دفتر کو کون سی قمیص پہن کر جائیں تاکہ سفید پوشوں کے ذمرے میں ہمارا شمار ہو سکے۔“

”مزاج گرامی“

ایک معمولی سی بات ہے اور نہایت سیدھے سادے الفاظ میں پیش کی گئی ہے لیکن موجودہ ماحول میں سانس لینے والے ایک عام کلرک کی زندگی کتنی واضح اور صاف دکھائی دیتی ہے۔

یعقوب الہم کے افسانوں میں بے ساختہ پن ہے اور یہ بے ساختہ پن کسی تکلف یا آورد کا نتیجہ نہیں بلکہ زندگی کی سچائیوں اور تلخیوں کے گہرے مطالعہ کا آئینہ دار ہے۔ انہوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہی نہیں بلکہ جس انداز سے دیکھا ہے اسی انداز سے پیش کرنے کی سعی بھی کی ہے ہو سکتا

ہے کہ ان کے کسی نقطہ نظر سے کسی کو اختلاف ہو۔ لیکن نقطہ نظر کا یہ اختلاف زندگی اور اس کی تلخ صداقتوں کو جھٹلا نہیں سکتا۔ ان کا افسانہ ”آپنل کے پھول“ اس کی بہترین مثال ہے۔

یعقوب آسلم نے انسانی نفسیات کا بھی نہایت گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ انسانی ذہن میں کئی قسم کے (Complexes) پیدا ہوتے ہیں جنہیں کبھی بھوت پریت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کبھی جادو ٹونے سے آج ہندوستان کے متوسط طبقے کے بے شمار گھرانے ایسے (Complexes) کا شکار ہیں۔ جہالت اور کم علمی کا یہ گھٹا ٹوپ اندھیرا بہت دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ یعقوب آسلم نے اپنے افسانے ”چہروں کی دیوار“ میں ایسی ہی ایک الجھن کو بڑی فن کارانہ چابکدستی کے ساتھ سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ اور ان کا ایک اور افسانہ ”دراڑ“ بھی کچھ ایسے ہی موضوع کو پیش کرتا ہے۔

یعقوب آسلم کو زبان اور طرز بیان دونوں پر بڑی فن کارانہ قدرت حاصل ہے۔ وہ ایک منفرد اسلوب کے مالک ہیں۔ ان کے افسانوں کی زبان نہایت صاف شیریں، شگفتہ اور رواں ہے۔ صفحات کے صفحات پڑھتے چلے جائیے لیکن نہ کہیں عبارت میں کسی قسم کا جھول نظر آئے گا اور نہ کہیں علمیت کا اظہار۔ ثقیل اور نامونس الفاظ کی بھول بھلیاں ان کے یہاں مفقود ہیں۔ اکثر چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑے بڑے کی باتیں نہایت آسانی اور روانی کے ساتھ کہہ جاتے ہیں۔ اس طرح ان کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد قاری کو الفاظ کی بھول بھلیوں اور علامت کی تاریک و نا آشنا گلیوں میں بھٹکنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

فکر کی بلندی اور جستجو کا پھیلاؤ، ہر اچھے اور بُرے فن کار کو کائنات کے اُن ان گنت اور انجانے رموز سے آشنا کر دیتا ہے جن کے اظہار سے فن کار کی لاشعوری تہیں روشن سے روشن نظر آنے لگتی ہیں۔ اور فن کار اس روشنی میں اپنا ایک الگ چہرہ اور اپنی ایک خاص پہچان متعین کر لیتا ہے۔ یعقوب اسلم کے یہاں فکر اور جستجو کی لو آہستہ آہستہ فن کی بلندیوں کی طرف اپنے قدم اٹھاتی دکھائی دیتی ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ وہ وقت کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ اپنی منزل تک باسانی پہنچ کر اردو کے افسانوی ادب میں اپنے تابندہ لازوال اور غیر فانی نقوش چھوڑ جائیں گے۔ ●●

مطبوعہ ”چہروں کی دیوار“ ۱۹۸۶ء